Multilingual & Multidisciplinary Peer Reviewed
Refereed Monthly Magzine from Qila-e-Golconda,
Hyderabad, Deccan

ISSN:- 2454-4035

انوار تحقیق

جلد چہارم
جنوری - جون 2018

شمارة: 6-1
القيمة: 50 روبية

Editor
سيد الياس احمد مدني

Address
9-10-380,-Neem Bowli Masjid, Machora House, Golconda Fort, Hyderabad,
Telangana 500008 -

Multilingual & Multidisciplinary Peer Reviewed
Refereed Monthly Magzine from Qila-e-Golconda,
Hyderabad, Deccan

ISSN:- 2454-4035

ANWAR-E-TAHQEEQ

Volume: Forth
January -June 2018

Issue: 1-6
Price: Rs. 50/-

Editor
Syed Iliyas Ahmad Madni

Address
9-10-380,-Neem Bowli Masjid, Machora House, Golconda Fort, Hyderabad,
Telangana 500008 -

قلعہ گولکنڈہ، حیدرآباد، دکن سے ماہانہ ادبی مجلّہ.................(E-COPY)

انوار تحقیق

جلد۔۴ شمارہ۔۱ تا ۶ جنوری تا جون ۲۰۱۸ء

زرتعاون:۔فی شمارہ:۔۵۰ روپے سالانہ:۔۵۰۰ روپے

زرتعاون کا ذریعہ:
Mr. Mubarak Hussain
Accnt no.: 50045054076
IFSC CODE: ALLA-0210134
Allahabad Bank, AMU, Aligarh

نگراں:۔ **پروفیسر عزیز بانو**، صدر شعبہ فارسی، مانو، حیدرآباد، تلنگانہ

ایڈیٹر:۔ **سید الیاس احمد مدنی**

پتہ:۔ 9/10/389، نیم باولی مسجد، کٹھورا ہاؤس، گولکنڈہ قلعہ، حیدرآباد، تلنگانہ۔500 008

موبایل نمبر:۔09966647580 ای میل:۔anwaretahqeeq@gmail.com

مجلس ادارت

ڈاکٹر شاہد نوخیز اعظمی۔شعبۂ فارسی، مانو حیدرآباد

ڈاکٹر محمد عقیل۔شعبہ فارسی، بی ایچ یو، وارانسی

ڈاکٹر صولت علی خان۔ڈائرکٹر اے پی آر آئی ٹونک

ڈاکٹر محمد قمر عالم۔شعبۂ فارسی، اے ایم یو، علی گڑھ

محمد توصیف خان کاکر۔شعبۂ فارسی، اے ایم یو۔علی گڑھ

احمد نوید یاسر ازلان حیدر

مدیر سہ ماہی ادبی جریدہ ''دبیر''۔کاکوری، لکھنؤ

ارمان احمد

مدیر سہ ماہی ادبی جریدہ ''عرفان''۔چھپرا، بہار

عاطفہ جمال

مدیر سالنامہ ''کوکب ناہید'' سندیلہ، ہردوئی

ڈاکٹر ای اے حیدری۔صدر شعبۂ اردو گورنمنٹ لوہیا کالج چورو

متھی علی خان۔نامہ نگار روزنامہ منصف، حیدرآباد، دکن

عباس حیدر نقوی، رسرچ اسکالر، اے ایم یو، علی گڑھ

مجلس مشاورت

پروفیسر مسعود انور علوی۔شعبہ عربی اے ایم یو، علی گڑھ

پروفیسر عمر کمال الدین۔شعبۂ فارسی، لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ

پروفیسر سید حسن عباس۔شعبۂ فارسی، بی ایچ یو، وارانسی

پروفیسر سید محمد اسد علی خورشید۔صدر شعبہ فارسی، اے ایم یو، علی گڑھ

پی انورادھا ریڈی۔انٹیک، تلنگانہ اسٹیٹ، حیدرآباد۔چاپٹر

ڈاکٹر زرینہ پروین۔ڈائرکٹر آف آرکائیوز، حیدرآباد، دکن

ڈاکٹر سید محمد اصغر عابدی، شعبہ فارسی، اے ایم یو، علی گڑھ

احمد علی، کیپر مینسکر پٹ۔سالار جنگ میوزیم، حیدرآباد

ڈاکٹر سیدہ عصمت جہاں۔شعبۂ فارسی، مانو حیدرآباد

ڈاکٹر ایم اے نعیم، حیدرآباد، دکن

جناب ایم اے غفار، استاد خطاطی، ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد

کشور جھن جھن والا، ماہر مسکوکات، ممبئی

امر بیر سنگھ۔ماہر مسکوکات۔حیدرآباد

فہرست مندرجات

	عنوان	زبان	مقالہ نگار	صفحہ
۱۔	ضیاءِتصوف			۳
۲۔	شیخ محمودالحسن صولتؔ ٹونکی	(فارسی)	صاحبزادہ ڈاکٹرصولت علی خان	۴
۳۔	عقیل شادابؔ بہ حیثیت غزل گو	(اردو)	ڈاکٹرمعین الدین شاہینؔ	۱۱
۴۔	علی جوادزیدی کے رثائی متون:ایک تنقیدی جائزہ	(اردو)	ڈاکٹر عابدحسین حیدری	۲۰
۵۔	کہاوت اور حکایت اور شریف احمد قریشی ایک مطالعہ	(اردو)	ڈاکٹرای اے حیدری	۳۸
۶۔	رسالہ آفتاب ایک تحقیقی جائزہ	(اردو)	ڈاکٹرارشدسراج	۴۲
۷۔	رئیس الاحرارمولانامحمدعلی جوہرآسمان صحافت کاشب چراغ گوہر		صاحبزادہ شوکت علی خاں	۴۴
۸	احتشام حسین کی مکتوب نگاری		ڈاکٹراکبرمہدی مظفر	۴۷

ضیاءِ تصوف

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ہمارے پاس ظاہری وسائل نہیں ہیں تو ہم یہ تو کر ہی سکتے ہیں کہ اپنے اعمال کو اللہ کی مرضی کے مطابق بنائیں اور بارگاہ الٰہی میں تضرع کے ساتھ دعائیں کریں۔ دعا کوئی معمولی چیز نہیں ہے دعا کی اہمیت کو سمجھنے کے لئے مندرجہ ذیل آیات واحادیث کے مفہوم وترجمے پر غور کریں

دعا عبادت کا مغز ہے۔ ترمذی

دعا عین عبادت ہے۔ ترمذی، ابوداؤد، نسائی

کیا میں تمھیں وہ عمل بتاؤں جو تمہارے دشمنوں سے تمہارا بچاؤ کرے اور تمھیں بھرپور روزی دلائے، وہ یہ ہے کہ رات میں اور دن میں اپنے اللہ سے دعا کرو، کیوں کہ دعا مومن کا ہتھیار یعنی اس کی خاص طاقت ہے۔ ابوالعلیٰ موصلی

پکارنے والا جب مجھے پکارتا ہے تو میں اس کی پکار کو سنتا ہوں اور جواب دیتا ہوں۔ سورۃ البقرآیت ۱۸۶

تم مجھ سے دعا کرو میں قبول کروں گا۔ سورۃ المومن آیت ۶۰

دعا کے سوا کوئی چیز تقدیر کو نہیں بدل سکتی۔ ترمذی، مسند احمد

جو اللہ سے نہ مانگے اللہ اس پر ناراض ہوتا ہے۔ ترمذی

ان آیات واحادیث کے مفہوم ومعنی سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ اللہ اور رسول ﷺ کے نزدیک دعا کا کیا درجہ ہے

دعا عبادت کی اصل اور اس کی روح ہے۔

دعا مومن کی خاص طاقت اور اس کا ہتھیار ہے۔

دعا سے تقدیر بھی بدل سکتی ہے (بشرطیکہ قضائے مبرم نہ ہو)

اللہ نے دعا مانگنے کا حکم دیا ہے اور اس کو قبول کرنے کا وعدہ کیا ہے۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے آگاہ کیا کہ جو بندہ اس سے دعا نہیں مانگتا اللہ تعالیٰ اس پر ناراض ہوتا ہے۔

شیخ محمودالحسن صولتؔ ٹونکی

صاحبزادہ ڈاکٹر صولت علی خان
ڈائرکٹر اے پی آر آئی ٹونک

ای مرکز خوبی بچہ نامت خوانم
اقلیم سخن صوفی را صولتؔ دانم

جان من جانان من این شیخ محمودالحسن — قیصر ملک سخن این شیخ محمودالحسن
صولت شان چمن این شیخ محمودالحسن — نور شمع انجمن این شیخ محمودالحسن

ظل ظلال خدائی ذوالمنن، آئینہ دار جلال و جمال نورفگن، غلام خانہ زاد پنجتن، نور ساطع وضیاء لامع فگن، اعداء شکن، شہر یار زمین وزمن، خاصۂ خاصان شعر و سخن، شناور دریائی سلوک قبلۂ من کعبۂ من، قبلہ گاہ من، جان پناہ من، پیر من، آقائی من، راہبر وراہ نمائی من، نازنین من، ناز بردار من، دستگیر من، پیرو شیخ و بابائی من، یعنی فیض انتساب، تفضّل جناب، شاہ انتخاب، روضۃ الالباب، جانان من، حضرت مولانا سیدنا محمودالحسن ہاشمی مطلبی حضرت صولتؔ نور اللہ مرقدہ

ای چہرۂ زیبائی تو رشک بتان آذری
ہر چند وصفت می کنم در حسن از آن زیبا تری

درویش وسالک وصوفی وصافی راز دار ومحرم اسرار وانوار، سخنور وسخن سنج وسخن فہم وسخن دان وشناور بحر علم وفن۔

ای مجموعۂ صفات وکمالات بچہ نامت خوانم بمصداق شعرا میر خسرؔو

آفاق را گرویدہ ام مہر بتان ورزیدہ ام
بسیار خوبان دیدہ ام لیکن تو چیزی دیگری

این باعث سعادت وخوش بختی راقم الحروف است کہ آقائی حضرت صولتؔ بوقت تولد من بہ مناسبت اسم خود نسبت علیا اسم من 'صولت علی' انتخاب فرمود وتہنیت وتبریک منظوم عطا فرمود

نام صولت علی رکھا ہے جو اس گل رو کا
یہ سلامت رہے، پروان چڑھے، پھولے پھلے
نیکی و علم و ہنر سے یہ مزین ہو مدام
رہتی دنیا رہے شوکت علی ترے سر پر

نسبت حیدر کرار مبارک باشد
نو شگفتہ گل گلزار مبارک باشد
خوبی نزہت کرار مبارک باشد

دست آل شہ ابرار مبارک باشد

مؤلف ’چہار مقالہ‘ نظامی عروضی سمرقندی در کتاب خود فصل ’در چگونگی شاعر و شعراو‘ گفتہ کہ:

’اما شاعر باید کہ سلیم الفطرت عظیم الفکرت، صحیح الطبع دقیق النظر باشد‘۔ این ہمہ وصفہا در شعر حضرت صولتؔ تونکی بدرجۂ اتم موجود است ۔ در شعراو متانت وسنجیدگی وحلاوت وعذوبت است ۔ آن بسیار زود گو سخن ور و ماہر عروض بود ۔ صاف وسلیس زبان داشتہ دور ہر خیال وفکر عظیم در اشعار خویش صنعت بسیار استعمال کرد ۔ آن نہ فقط شعر گفتی بلکہ شعر شناس وشعر دوست بود ۔

آقائی حضرت صولت تونکی چنین سخنور وسخن پرداز کہ برصنف ہر شاعری طبع آزمائی کرد، مانند حمد ونعت ومنقبت ومرثیہ،قصیدہ ورباعی ،نظم، غزل، سجع، تضمین، خمسہ، سہرا وچہار بیت وغیرہم

آقائی صولتؔ در بارۂ حمد پروردگار خالق کائنات می سراید

جو غرقِ بحرِ مصائب ہیں ان کو دنیا میں
ترا کرم ہے الٰہی ابھارنے والا

آقائی صولتؔ در بارۂ نعت سرکار دوعالم نور مجسم رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم می سراید

کیوں دل کو نہ ہو الفت سلطان مدینہ
ہے طاعت حق طاعت سلطان مدینہ
میں اور کہاں داور محشر کی حضوری
کام آئی فقط نسبت سلطان مدینہ

ہوئی نصیب جسے خاک پائے شاہ عرب
زمیں پہ ہو کے وہ صولتؔ فلک جناب ہوا

آقائی حضرت صولتؔ نعت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم در صنف چہار بیت می سراید

سروری دونوں جہاں کی ہے سزاوار تمھیں
حق نے مختار کیا سید ابرار تمھیں
اتنا رتبہ تو کسی اور نبی کو نہ ملا
جس کو اللہ نے محبوب بنایا اپنا
شب معراج میں بلواکے اٹھا کر پردہ
خوب اللہ نے دکھلا دیا دیدار تمھیں
سروری دونوں جہاں کی ہے سزاوار تمھیں
حق نے مختار کیا سید ابرار تمھیں

آقائی صولتؔ درمنقبت می گوید

نہیں پھرا کوئی ناکام مانگنے والا
کہ تیرے در پہ جو آیا وہ کامیاب ہوا

شاعرشیرین بیان حضرت صولتؔ برائی فلسفۂ حیات می سراید

ہوش و خرد کو ان کا پتا کچھ نہ مل سکا
سو بار جا کے ڈھونڈھ لیا لا مکاں تلک

تو کون ہے یہ تیری سمجھ میں نہ آئے گا
سمجھائے کوئی اب تجھے ناداں کہاں تلک

کس کو معلوم کہ آباد رہے گی کب تک
کس کو معلوم کہ آباد ہے دنیا کب سے

درشاعری اوسوز وگداز میرؔ،طرز فانیؔ وفکر غالبؔ بود۔چنین منفردطرز بیان ندیدہ۔اشعار چند ملاحظہ بفرمائید۔

گلشن پہ آسماں سے برستی ہیں بجلیاں
آفت یہ چار تنکے مرے آشیاں کے ہیں

شاعرشیرین بیان حضرت صولتؔ برائی دربارۂ شوخی محبوب می سراید

یہ کیسی دل ربائی ہے نگاہ ناز قاتل میں
کہ پیدا قتل ہونے کی تمنا ہوگئی دل میں

استادصائبؔ تبریزی فرمودہ بود۔

دست طلب چو پیش کسان می کنی دراز
پل بستہ ای کہ بگذری از آبروئی خویش

استاد باکمال آقائی حضرت صولتؔ نیز ہمین مضمون فرمود

ہے دست سوال ایک عزت فروشی
یہ میں اپنے نام و نشاں بیچتا ہوں میں

استاد باکمال آقائی حضرت صولتؔ درشان محبوب ہمین طورمی سراید

کہاں سے لائے گا آئینۂ عالم مثال ان کی
خود ان کا عکس بھی ان کے مقابل ہو نہیں سکتا

شاعرمی گوید کہ محبوب من ومثال محبوب من بی عدیل وبی نظیر است کہ عکس محبوب من نیز مقابل نمی تواند شد

آ قائی حضرت صولتؔ برائی توصیف محبوب وتوصیف پرتوعذار یار می سراید

عذار یار کے پرتو نے رخ یہ دو بدلے
اک آفتاب ہوا ایک ماہتاب ہوا

نگاہ شوق تری پڑ گئی ہے جس پر بھی
نہ دل سے دور کبھی اس کے اضطراب ہوا

آ قائی حضرت صولتؔ یکی از بزرگ ترین سخنور و بادشاہ تغزل وتصوف وشاعر مکمل ہست،آن نہ فقط سخنور ہست بلکہ یکی ماہر زبان دان،نقاد ماہر علم عروض واستاد کامل بود،شاعر شیرین بیان،سلیم الطبع عظیم الفکر دقیق النظر عمیق الفکر بود۔

در شاعری آ قائی صولتؔ نازک خیالی،جدت طرازی،مصوری،جادو بیانی،معاملہ بندی،حقیقت نگاری واقفیت حسن وعشق ومستی وواردات حیات بدرجہ اتم موجود است،زورکلام وندرت خیال ملاحظہ بفرمائید

یہ مرا حسن تصور بڑا مصور ہے
خیال سے تری تصویر اتارنے والا

گھٹائیں چھا گئیں ہر سمت کیف و مستی کی
اسی طرح نگہِ نیم باز رہنے دے

سارے جہاں کی رونقیں تم میں سمٹ کے آ گئیں
حسن کا باغ لگ گیا آ گئے تم جہاں نظر

سجدے نصیب ہوں اگر باب حریم ناز پر
طول حیات جاوداں کردوں نثارِ سگِ در

کسی کروٹ تو چین آئے کسی پہلو تو کل آئے
الٰہی کوئی تو صورت تسلّی کی نکل آئے

دست جنوں خدا کے لئے اب تو رحم کر
رکھے گا مجھ کو چاک گریباں کہاں تلک

اللہ رے جمال و زہے عظمت جمال
بیکار ہو کے رہ گئے ایمان و دیں تو اب

یہ سنگ آستاں میں ترے جذب ہو گئی

اٹھے گی تیرے در سے نہ میری جبیں تو اب

صولتؔ نے گل کھلانے کی اب اس میں ٹھان لی
گلزار ہی بنے گی غزل کی زمیں تو اب

چلو یہ عمر فانی دے کے ہاتھوں ہاتھ لے آئیں
حیات جاودانی لٹ رہی ہے کوئے قاتل میں

تیری وفا پہ پورا مجھے اعتماد ہے
مجھ سے نگاہیں پھیر لے ایسا نہیں ہے تو

اب اس میں کوئی اور نہیں ہے ترے سوا
اب دل ترا مکان ہے اس کا مکیں ہے تو

صولتؔ تری غزل میں نہ رہ جائے کچھ کمی
دنیا یہ جانتی ہے تجھے نکتہ چیں ہے تو

ابھی کم سن ہیں وہ کیا جانیں دردِعشق کیا شئے ہے
وہ کیا سمجھیں کہ آخر کیوں مرے آنسو نکل آئے

ترے ارمان دل میں رہتے رہتے درد بن بیٹھے
جنھیں ہم دوست سمجھے تھے وہی دشمن نکل آئے

ایک لمحہ بھی اگر ان کا تصور نہ رہے
کیا بھیانک در و دیوار نظر آتے ہیں

تو کوئی زحمت نہ کر اے چارہ گر میرے لئے
آپ درماں ہے مرا درد جگر میرے لئے

حسن کے جلووں کو عمر جاوداں بخشی گئی
اور رکھی یہ حیات مختصر میرے لئے

اچھی صورت اچھی نظروں سے ستم ہے دیکھنا
جرم ہے گویا مرا ذوق نظر میرے لئے

حسن کامل کا یہ عالم ہے کہ ان کے منہ سے پھول جھڑتے دم گفتار نظر آتے ہیں

بہر شب اک نئی صورت بدل کر سامنے آئے
مقابل تیرے رخ کے ماہ کامل ہو نہیں سکتا

وہ رخ زیبا سے جو اپنے الٹ دیتے نقاب
ہم شب تاریک میں عالم درخشاں دیکھتے

یہ تم نے مسکرا کے حجاب بہار میں
سب گل کھلائے ہیں چمن روزگار میں

وہ مسکرا کے دیکھ رہے ہیں مری طرف
ہے آج کائنات مرے اختیار میں

اونچی نظر بھی کیجئے تبسم کے ساتھ ساتھ
فرمایئے کچھ اور اضافہ بہار میں

گیسو وہ رخ پہ ڈالے ہوئے محو خواب ہیں
گویا چمن ہے سایۂ ابر بہار میں

حق گوئی میں کسی کا ہمیں کوئی ڈر نہیں
صولتؔ جو بات کہنی ہو کہہ دیں ہزار میں

اف آدمی پہ آدمی کرتا ہے سختیاں
اب دل کسی کا دل نہ رہا سنگ ہو گیا

آپ کے لطف عام کا یہ بھی امیدوار ہے
صولتؔ خستہ حال پر رحم و کرم کی ایک نظر

ان کے کوچے سے جو تو ہو کے معطّر پلٹے
اس طرف بھی کبھی اے باد صبا ہو جانا

مجھ سے پہلے بھی کسی نے تمھیں چاہا تھا کبھی
یہ بتادو تمھیں اغیار نے چاہا کب سے

کب تم رہِ حیات میں ہم سے جدا رہے   تھے تم ہمارے ساتھ ، گئے ہم جہاں تلک

ترا جمال سلامت رہے یہی تو ہے
چمن میں رنگ گلوں کا نکھارنے والا

شاعر عذوبت بیان بر جستہ ترین شعر می گوید، مجموعۂ اشعار و کلام شاعر شیرین مقال حضرت صولتؔ تحت، کلیات و ابیات، منتشر و غیر مرتب اند، کسی تا ہنوز ترتیب نہ کردند

آ قائی حضرت صولتؔ در سال ۱۳۱۴ھ (یک ہزار و سہ صد و چہاردہ ہجری) مطابق ۱۸۹۵ء میلادی (یک ہزار و ہشت صد و نود و پنج میلادی) تولد یافت

آ قائی حضرت صولتؔ بہ تاریخ ۲۹/ مارچ ۱۹۶۸ء میلادی (یک ہزار و نہ صد و شصت و ہشت میلادی) در بلدہ تونک داعی اجل را لبیک گفت

قطعۂ وفات حضرت صولتؔ نور اللہ مرقدہ حکیم ظہور احمد صدیقی المتخلص بہ نظرؔ تونکی بزبان فارسی ہمیں طور فرمود

خاور نقد و نظر در غرب رفت
محفل شعر و سخن تاریک شد

گو نہان شد صولتؔ شیرین نوا
از دل ما ای نظرؔ نزدیک شد

آ قائی عبد البصیر بصرؔ تونکی شعر تاریخی بزبان فارسی فرمود

ناقد شعر و سخن رطب اللسان انجمن   (۱۹۶۸ء)
شاعر و فن کار گنج علم محمود الحسن   (۱۳۸۸ھ)

از مصرعۂ اول یک ہزار و نہ صد و شصت و ہشت میلادی ظاہر شود و از مصرعۂ ثانی یک ہزار و سہ صد و ہشتاد و ہشت ہجری، سال وفات حضرت صولتؔ ظاہر می شود۔ آ قائی احترام الدین شاغلؔ جے پوری بعنوان قطعۂ تاریخ وفات سید محمود الحسن صولتؔ بزبان فارسی سرود

آن سید ذی وقار و محمود اطوار
کز خلق ِ حسن نمود خلقش اظہار

رحلت چو نمود زین جہان ِ فانی
کردہ بجنان قیام با عزو وقار

معلوم کنی چو سال فوتش شاغلؔ
یک بار بلند قدر گو و صولتؔ سہ بار   ۱۹۶۸ء

یک ہزار و نہ صد و شصت و ہشت میلادی سال تاریخ وفات بر آمد۔

بلند قدر صولت صولت صولت   ۱۹۶۸ء

(بقیہ صفحہ نمبر ۱۹ پر)

عقیل شادابؔ بہ حیثیت غزل گو (''بے آب سمندر'' کے تناظر میں)

ڈاکٹر معین الدین شاہینؔ

ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبۂ اردو

سمراٹ پرتھوی راج چوہان گورنمنٹ کالج، اجمیر

عقیل شادابؔ عہد حاضر کے غزل گویوں میں اس لئے انفرادی حیثیت رکھتے ہیں کہ انہوں نے مروجہ روش سے انحراف کرتے ہوئے ایسا اندازِ سخن اختیار کیا جو ملکی و غیر ملکی سطح پر اُن شعراء کے دوش بدوش معلوم ہوتا ہے جنہوں نے صنفِ غزل کو سوقیانہ آلودگی کے ماحول سے نکال کر کھلی فضا میں سانس لینے اور غواصی کرنے کے مواقع فراہم کرائے۔

فی الوقت شادابؔ مرحوم کا مجموعۂ غزلیات ''بے آب سمندر'' راقم کے پیشِ نظر ہے اور اُسی کے تناظر میں گفتگو مقصود ہے۔ یہ مجموعہ اس لئے بھی مثبت تاثرات چھوڑتا ہے کہ اس میں کسی قسم کی تعریف، تحسین، تقریظ، مقدمہ، پیش لفظ یا تاثراتی تحریریں شامل نہیں ہیں۔ مرحوم کے اس عمل سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ آپ اپنی شاعری اور اُس کی تاثیر سے کلّی طور پر مطمئن تھے۔ اور کسی طرح کی رسمی تعریف و توصیف یا یوں کہئے گویا سستی شہرت کا مطالبہ کرنے سے گریز و پرہیز کرتے تھے۔ انہیں یہ بھی علم تھا کہ ادب کے باشعور قارئین و شائقین از خود مشمولات کے مطالعے اور مشاہدے کے بعد اپنی اپنی رائے قائم کرلیں گے۔ اور ہوا بھی یہی کہ جب یہ مجموعہ منظرِ عام پر آیا تو مختلف مکتبۂ فکر سے وابستہ حضرات نے منفی اور مثبت دونوں طرح کی آراء ظاہر کیں۔ بعض ایسے حضرات ان رائے دہندوں میں موجود تھے جنہوں نے کلام کی نوعیت و اہمیت کو یکسر پس پشت ڈالنے کی کوشش کی۔ ایسے حضرات نے زیرِ نظر مجموعۂ کلام کو بے راہ روی کا شکار بتایا۔ لیکن وقت کے تقاضوں کا خیر مقدم اور احترام کرنے والوں نے ایسے حضرات سے کلامِ شادابؔ کا از سرِ نو مطالعہ و مشاہدہ کرنے کا مطالبہ کیا تاہم جن حضرات نے مطالبے پر لبیک کہا انہوں نے جلد ہی اپنی رائے بدل کر مشمولات کے انفرادی لب و لہجے کی تاثیر سے اتفاق ظاہر کیا۔ دوسری طرف ایسے حضرات بھی دیکھنے میں آئے جنہوں نے رفتہ رفتہ اور دبی دبی آواز میں کلامِ شادابؔ کی اثر پذیری کا اعتراف کرنا شروع کردیا۔ ابتداءً جو حضرات شادابؔ صاحب کی شاعرانہ صناعی کے منحرف تھے وہ ''بے آب سمندر'' کے مشمولات کو پڑھ کر سر دھُننے لگے۔ یہاں ایسے اشعار پیشِ خدمت ہیں جنہوں نے شادابؔ شناسی کو بڑھاوا دیا ؎

اک کھڑکی نے جھک کر اُسے سلام کیا
کپڑے سکھانے جب جب چھت پر آئی دھوپ

ہُوں دیارِ یقیں کا پروردہ
شہرِ وہم و گماں میں رہتا ہوں

مجھ سے ڈر کر میرا سایہ
صحرا صحرا بھاگ رہا ہے

کس پہ کروں شادابؔ بھروسا
آئینہ بھی بے چہرا ہے

زبانِ حال سے کہتی ہیں داستانِ مآل
سکوت میں بھی ہیں محوِ خیال دیواریں

شگافِ شب سے ہوس کے نہ سانپ در آئیں
ذرا سنبھال کے رکھنا بدن کی جنت کو

اپنے سینے میں سرابوں کا سمندر لے کر — کب سے آوارہ ہوں سوکھے ہوئے بادل کی طرح
خود اپنے آپ سے ملنا بھی اب محال ہوا — حسد سے دیکھ رہا ہوں میں اپنی شہرت کو
جب میرے گھر میں آگ بھڑکی تھی — ملنے آیا تھا وہ ہوا کی طرح
واقف ہوں پھولوں کے سیاست دانوں سے — کانٹے سے کانٹا نکالتا رہتا ہوں
مطمئن ہوں میں اپنے مٹنے پر — میری آسودگی کو مت کوسو

عقیل شاداؔب نے چونکہ اردو ادب کے علاوہ دیگر ہندوستانی ادبیات کا بھی مطالعہ کیا تھا اس لئے اُن کے فکر و تدبّر میں گہرائی اور گیرائی پیدا ہوگئی تھی۔ انہوں نے سنسکرت اور ہندی کی ادبیات وشعریات سے اثر قبول کیا اس لئے ان ادبیات وشعریات کے اوصاف، محاسن اور روشن پہلو اُن کی غزلیات میں مخلوط ہو کر تخلیقی لوازمات کو مزیّن کرتے رہے۔ اُن کی چمک دمک اکثر معاصر شعرائے غزل کو بھی دعوتِ فکر و عمل دیتی ہوئی نظر آتی ہے، مثلاً :

جڑیں اس کی بہت گہرائی تک ہیں — اُگا ہے روح میں چھتنار برگد
شرن میں، میں بھی تیری آگیا ہوں — لگا میرا بھی بیڑا پار برگد
لمحہ لمحہ مرگِ مسلسل ہے اپنا — جیون ناگ پھنی کا جنگل ہے اپنا

تُو ہے اک موجِ رواں اور میں ہوں پتھر گھاٹ کا
لکھ رہے ہیں دونوں افسانہ ندی کے پاٹ کا

کیسا مکّہ، متھرا، کعبہ، کاشی ہے — من بیراگی اپنا تو سنّیاسی ہے
یہ تو اچھی خاصی وِش کنّیا نکلی — ہم سمجھے تھے دُنیا اپنی داسی ہے

کیسا کھونا، کیسا پانا ماٹی کا — ٹوٹے گا اک روز کھلونا ماٹی کا
کستوری سی مہک رہی ہے چاروں اور — چھان رہا ہوں کونا کونا ماٹی کا
بسی ہوئی ہے تلسی کی خوشبو گھر میں — رچا ہوا ہے روپ سلونا ماٹی کا

آسمان کے منہ پر تھوک دیا ہے میں نے گھبرا کر
دھرتی ماں کی کوکھ مجھے پیدا کرکے شرمائی ہے

بازاروں میں بھاؤ نہ اپنا گر جائے — کھوٹے سکے اُچھالتا رہتا ہوں
ترشنا چین نہیں لینے دیتی ہے مجھے — اندھے کنویں میں ڈول ڈالتا رہتا ہوں
انگنائی چھٹپٹا رہی ہے واپس آ — گھر کی چوکھٹ بلا رہی ہے واپس آ

پنگھٹ سونا ہے چوپال اکیلی ہے — برکھا آنسو بہا رہی ہے واپس آ

عہدِ رفتہ کا گھاؤ روشن ہے — آنسوؤں کا الاؤ روشن ہے
میرے شعروں میں جا بہ جا شادابؔ — زندگی کا بہاؤ روشن ہے

نیل کنٹھ پیدا ہوتے ہیں دنیا میں — کرواتی ہے جب امرت منتھن روٹی

ہر شاعر،اہلِ قلم،مصور،موسیقار،اہل علم ودانش اور فنون لطیفہ سے وابستہ شخص کا کوئی نہ کوئی نظریۂ فن ضرور ہوتا ہے جس کا اعلان اعتراف اور وضاحت وصراحت وہ مختلف طریقوں اور حوالوں کی وساطت سے کرتا رہتا ہے۔چونکہ عقیل شاداب سرگرمِ عمل اور بیدار مغز شاعر تھے تاہم آپ نے ''بے آب سمندر'' کی غزلیات کے حوالے سے نہ صرف اپنے نظریۂ فن کا اظہار کیا بلکہ اپنے عہد اور ماقبل عہد کے ادبی منظرنامے پر اعتدال پسندانہ تبصرہ بھی کیا ہے۔اپنی شاعری پَر لگائے گئے الزامات خصوصاً عریانی کے سلسلے میں معاصرین کی کہی گئی ایک طرفہ باتوں کا بھی آپ نے بہ نفسِ نفیس جواب دیا ہے، یہ جواب کبھی اصلاح کی صورت تو کبھی بے باکی کے توسط سے اشعار کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔شاعری کی مختلف جہتوں،روایتوں اور اصول ونظریات کے ساتھ ساتھ معیار ومیزان کی کسوٹی پر اپنے قرب وجوار کی ادبی صورتِ حال پر ایسی تنقیدی آراء بھی پیش کی گئی ہیں جو میانہ روی پر مبنی ہیں۔ذیل میں اپنے متعدد اشعار پیش کئے جا رہے ہیں جو مذکورہ پہلوؤں سے گہرا تعلق رکھتے ہیں، یہ اشعار راقم کی غیر جانب داری کے بھی غماز ہیں اور ان اشعار کے پیش نظر راقم کا بیان محض ظن وقیاس پر مبنی نہیں ہونے کا ثبوت بھی فراہم ہو جاتا ہے :ے

چھوا جس لفظ کو شادابؔ میں نے — غزل بن کر چمک اُٹھّا اچانک

دل نہ جن کے گداز ہوں شادابؔ — وہ سخن ور نہیں ہوا کرتے
آ گئی فکر و نظر میں تازگی — اب میرا لہجہ نیا لگنے لگا ہے

میرے شعروں میں جا بہ جا شادابؔ — زندگی کا بہاؤ روشن ہے

آج کل شادابؔ پردے میں سخن کے — لفظ ومعنیٰ کی عبادت کر رہا ہوں

مجھ کو لکھنے سے کون روکے گا — ہے بہرحال میرا حق لکھنا
مشکلیں اور بھی ہیں دنیا میں — شعر شادابؔ کیوں ادق لکھنا

تھوتھی غزلیں، مری وراثت تھی — کھوکھلے لفظ میرا ترکہ تھا

عام روش سے ہٹ کے چلا جائے شادابؔ — کچھ اونچا اپنا معیار کیا جائے

یہ سچ ہے میرا روایت پہ اعتبار نہیں — لکیر پیٹتے رہنا مرا شعار نہیں
اسے فضول حوالوں سے زیر بار نہ کر — یہ شاعری ہے مری جان کاروبار نہیں
مرا کلام ہے آئینہ عصرِ حاضر کا — جدیدیت کا مرے ذہن پر بخار نہیں

ہے فکر وفن میں مرے زندگی کا ہر پہلو
کسی بھی اِزم کا تک میں زیرِبار نہیں

کبھی کبھی کوئی پل لازوال ہوتا ہے
ہر ایک شعر کسی کا بھی شاہکار نہیں

نئی نویلی زمینوں کی چاٹ نے مارا
مجھے خود اپنے تجسس کی کاٹ نے مارا

میری زباں کو میرا ہی ہمزاد ڈس نہ لے
شادابؔ کوئی لہجہ نیا بخش دو مجھے

روایتوں سے گریزاں رہے جئے جب تک
گلاب زاروں میں تنہا ببول بن کے رہے

مجھ پر پھبتی کسنے والو تم کیا جانو
خاموشی کے گھاؤ بہت گہرے ہوتے ہیں

عُریانی تو ذہنوں کے اندر پلتی ہے
کپڑوں کے اندر تو سب ننگے ہوتے ہیں

کرنے کو سب ہی کرتے ہیں شادابؔ شاعری
الفاظ کس کے پاس، اثر کس کے پاس ہے

میرے ہر ایک شعر میں شادابؔ
حسنِ زیر وزبر سلامت ہے

ہے شاعری وہی شادابؔ جو بہ ہر صورت
لبوں پہ شعر دلوں میں اصول بن کے رہے

ہم نے ایوانِ غزل میں شادابؔ
غالبؔی کی کبھی میرؔی کی ہے

ایسے کی شاداب پوری یہ غزل
جیسے ہوتی ہے دلہن آراستہ

کھوکھلے الفاظ کی بھرپائیوں میں کٹ گئی
عمر ساری قافیہ پیمائیوں میں کٹ گئی

گِر گیا ہے آج کل کس درجہ معیارِ سخن
مجھ سے اک نادان کی دانائیوں میں کٹ گئی

گور ہا شادابؔ غالبؔ میں حریفوں پر مگر
میری اپنے آپ سے پسپائیوں میں کٹ گئی

عقیل شادابؔ نے تادمِ حیات مادرِوطن سے ٹوٹ کر محبت کی جس کا ثبوت کوٹہ اور چمبل کے استعاروں اور حوالوں سے فراہم ہوتا ہے۔اپنی جائے پیدائش سے اس قدر عقیدت ومحبت کے طفیل انہیں اپنے علاقے میں ہر دل عزیز سخن ور ہونے کا اعزاز حاصل ہوا۔کوٹہ اور چمبل پر وہ اِس قدر مفتخر ہیں کہ چہک چہک کر اور لہک لہک کر اس کا تذکرہ کرتے ہیں۔لیکن کوٹہ میں جب مذہبی فسادات رونما ہوئے تو شادابؔ صاحب تڑپ اٹھے اور اپنی نم ناک آنکھوں سے جو دل خراش مناظر آپ نے دیکھے اُن کا ذکر درد وکرب کے ساتھ موقع بہ موقع کرتے رہے، اور اہلِ کوٹہ سے مہر ومحبت اور یگانگت کا مطالبہ بھی ان اشعار کی روح میں مضمر دکھائی دیتا ہے، ذیل میں ''بے آب سمندر'' سے چند مثالیں اس بابت ملاحظہ فرمائیں :ـ

ایسا کوٹا ایسی چمبل ایسا گھر
کہاں ملے گا یہ گنگا جل ایسا گھر

آگ خون کی ہولی کھیلنے والوں نے
بنا دیا پل بھر میں مقتل ایسا گھر

میں چمبل سا اُلٹا بہتا ہوں شادابؔ
جنم جنم سے رواں دواں کوٹے میں ہوں

دونوں اپنے جنم جنم کے ساتھی ہیں
کوٹا کی ماٹی اور چمبل کا پانی

آپ اپنی نظیر سی چمبل   کوٹا رانجھا سا ہیر سی چمبل
چاندنی رات میرے پہلو میں   ایک ناری شریر سی چمبل
ہے جلال وجمال کی مظہر   فکرِ اقبالؔ ومیرؔ سی چمبل
عہدِ حاضر کی جیسے روحِ رواں   عہدِ نو کے ضمیر سی چمبل
اپنی غزلوں میں ڈھل گئی شادابؔ   مصرع مصرع کبیر سی چمبل

ہمیں تو اپنا کوٹا کوفہ جیسا ہے   اور فرات کے بدلے چمبل ہے اپنا

جنم جنم سے کوٹا اپنا مقتل ہے   میں چمبل کا چمبل میری پیاسی ہے

آگ لگانے آئے تھے جو میرے گھر   وہ سب چہرے جانے پہچانے نکلے
مندر مسجد کی بنیادیں کانپ اٹھیں   بچّے جب ماؤں کو دفنانے نکلے
شہرت کے بھوکے لعشوں کے سوداگر   اخباروں میں خبریں چھپوانے نکلے
شہر میں گویا مرگھٹ کا سناٹا تھا   اپنے کیے پر جب ہم پچھتانے نکلے
ایک خدا کی بستی جل کر راکھ ہوئی   چند محافظ سنگینیں تانے نکلے
ان پر کیسے پورے اتروگے شادابؔ   نئے نئے مذہب کے پیمانے نکلے

ردیفوں قافیوں بحروں سے خون ٹپکے گا   غزل کہوں گا تو لفظوں سے خون ٹپکے گا
ہمارے عہد کی تاریخ جب رقم ہوگی   قلم سے ، حرفوں سے ، صفحوں سے خون ٹپکے گا
لکھوں گا سچ تو کتابیں جلا دی جائیں گی   کروں گا ضبط تو پوروں سے خون ٹپکے گا
اسی طرح سے فسادوں میں گھر جلیں گے اگر   رحیمؔ و تلسیؔ کے دوہوں سے خون ٹپکے گا
لگی جو مہر زبان وبیان پر شادابؔ   اشاروں اور کنایوں سے خون ٹپکے گا

آگ میں خود ہی جل گیا اپنی   غیر کا گھر جلانے نکلا تھا
دفن ہوں آپ اپنے ملبے میں   گھر پڑوسی کا ڈھانے نکلا تھا

اتنے گھر جلتے دیکھے ہیں آنکھوں نے   اپنے گھر میں دیا جلاتے ڈرتا ہوں

کہیں نہ حرمتِ ہمسائیگی پہ حرف آئے   میں اپنے ہاتھ سے اپنا ہی گھر جلادوں گا
نہ ہو کہیں مرے قاتل کو کچھ پشیمانی   چراغ گھر کے سرِ شام ہی بجھا دوں گا
بنے بنائے کھلونے جو توڑ دیتا ہے   میں اُس کو شیشہ گری کا ہنر سکھادوں گا

ہمارے بیچ میں کوئی نہ بھید بھاؤ رہے — میں اپنے جسم کی دیوار بھی گرا دوں گا

لگا شاداؔب جب دل پر کچوکا — غزل تخلیق ہونے سے نہ چوکی

عقیلؔ شاداؔب کے تجربات ومشاہدات مختلف شعری استعارات،تلازمات،اصطلاحات اورتمثیلات وغیرہ کےحوالوں سےاپنے زندہ وجُھندہ ہونے کااحساس کراتے دکھائی پڑتے ہیں۔دراصل علی گڑھ میں زیرِتعلیم رہتے ہوئے شاداؔب صاحب نےاُن شعراء کی صحبتیں حاصل کیں جن کی شاعری کوتمام دنیائے اردو میں سند کادرجہ ہمہ وقت حاصل رہا۔اس لئےعلی گڑھ کامجلسی علم اورمعاصر رسائل وجرائد کی ورق گردانی نےاُن کےفن شعرگوئی کوایسی جلا بخشی کہ معاصرغزل گویوں کی طرح انہوں نےبھی دھوپ،سورج،دھواں،سحر،صحرا،شجر،مٹّی،پانی،دریا،سمندر،آگ،ندی،گھر،آنگن،سنگ،پتھر، پیرہن،زمین،آسمان،پیکر،جنگل،آئینہ جیسےاشارات ولفظیات کےتوسط سےاپنےمافی الضمیر کامظاہرہ کیا۔

واضح ہوکہ اس روش نے1960ءکی جدیدیت کی تحریک کے زیراثر زور پکڑا تھا جس کا مدغم یا سنگم مابعدِ جدیدیت کے سمندر میں ہوگیا۔ترقی پسند تحریک کے خاتمے کے بعد راجستھان میں مذکورہ تحریکات کے تناظر میں ادبی کاشت کاری کرنے والے شعراء میں عقیلؔ شاداؔب کا نام وکلام انفرادی حیثیت کا حامل ہے۔متذکرہ استعارات،تمثیلات اورفن کارانہ افہام وتفہیم کی صراحت ووضاحت شاداؔب کے درج ذیل اشعار سے بھی ہوتی ہے : ے

اکثر میں نے اک لڑکی کے تصور میں — اوڑھی دھوپ، لپیٹی دھوپ، بچھائی دھوپ

میں نے مانا کہ میں اک ڈوبتا سورج ہوں مگر — اپنے سایے کو میں چھوٹا نہیں ہونے دوں گا

کل جہاں سے دھواں اٹھا تھا شاداؔب — اب وہاں میرا گھر نہیں باقی

شجر جو پھیلا پھلا تھا پڑوس کے گھر میں — عجیب ذائقہ اس کے پھلوں میں تھا شاید

اپنی طغنائی سے میں غرقاب ہوں — مجھ کو صحرا اور سمندر ایک ہے

موافق جب ہوئے دونوں کنارے — چڑھا حالات کا دریا اچانک

نمائش گاہ مٹّی کے کھلونوں کی ہے یہ دنیا — نہ رقصِ چاک تھمتا ہے نہ کوزہ گر بدلتا ہے

منعکس مجھ میں ہیں دونوں عالم — پیکر پیکر داخل خارج

انگنت جلوے ہیں منظر ایک ہے — پیرہن لاکھوں ہیں پیکر ایک ہے

ہر طرف ہے بارشِ سنگِ ہوس — اور میرے دوش پر سر ایک ہے

مٹّی ہمارے پاؤں کی ہے آسمان پر — کتنی بلندیوں پہ یہ بستی چلی گئی

جس دن سے وہ چلی گئی اپنے میکے — اس دن سے لگتا ہے جنگل ایسا گھر

یہ پرانا درخت آنگن کا جھیل پائے گا آندھیاں کتنی
رات ندّی پر نہانے آگئی سب دِشاؤں میں اُجالا ہوگیا

میں اپنے آپ کو کیسے نہ سنگ سار کروں مرے خلاف مرا دل اگر گواہی دے

اب کے برس بھی پچھلے برس کی طرح زمیں پانی کو بوند بوند ترستی چلی گئی

کریں تو کیسے کریں پار آگ کا دریا ندی چڑھے تو کنارے بھی ڈوب جاتے ہیں

اُس بدن کی کتاب میں اکثر میری قربت کا اقتباس آئے

شاذ و نادر ملیں گے دل سے دل ملنے کو گھر سے گھر ملیں گے بہت

قد و قامت دیکھ کے دھوکا مت کھا جانا ڈھلتے سورج کے سایے لمبے ہوتے ہیں

واقعاتِ کربلا کا تذکرہ ہر عہد میں شعرائے کرام کا موضوعِ خاص رہا ہے۔بعض شعراء نے مستقل مراثی تخلیق نہیں کئے لیکن انہوں نے اپنی غزلیہ شاعری کے حوالے سے گا ہے بہ گا ہے یا اکثر و بیشتر سانحۂ کربلا کو سانحۂ انسانیت و روحانیت کے بطور تمثیلی اور استعاراتی عمل میں دوہرانے یا یوں کہئے کہ برتنے کا فریضہ انجام دیا۔ یہ روایت سینہ بہ سینہ ہم تک پہنچی ہے۔ یہ معلوم ہے کہ عقیل شادابؔ گو کہ روایتی شاعر نہیں تھے لیکن صالح اقدار اور روایتوں سے کسبِ فیض ضرور کرتے تھے،تاہم ’’بے آب سمندر‘‘ کی اکثر غزلیات میں واقعاتِ کربلا سے متعلق ایسے اشعار مل جاتے ہیں جن میں ایک طرف امام عالی مقام اور شہدائے کربلا کے تئیں جذبۂ عقیدت ومحبت موجزن ہے تو دوسری طرف اپنے گرد ونواح اور قرب وجوار کی فساد زدہ فضاؤں اور روایتوں پر مرثیہ خوانی کا طرزِ عمل بھی موجود ہے۔بعض اوقات اُن کا استعاراتی نظام اپنے عہد کی افراتفری اور طوائف الملکی نیز یہ کہ ابتری وزوال آمادہ صورتِ حال و کیفیت کے پیشِ نظر حاکمِ وقت کو بابانگِ بلند یزیدِ پلید سے تشبیہ دینے پر بہ وجود مجبوری آمادہ ہوجاتا ہے۔ ذیل میں چند اسی قبیل کے اشعار زیرِ بحث مجموعۂ کلام سے منقول ہیں: ؎

ناگ پھنیوں کی سیاست کر رہا ہوں کیوں یزیدوں کی حمایت کر رہا ہوں
کرب کیوں بھولا ہوا ہوں کربلا کے کس لئے انکارِ بیعت کر رہا ہوں

باپ دادا کی وراثت کے لئے گھر کا آنگن کربلا لگنے لگا

حق پرستی وغارت گری کی لت نہ گئی یزید مر گیا لیکن یزیدیت نہ گئی

بناتِ زینب وزہرا کی آزمائش میں اُنہیں یزید کا دربار بھی عطا کردے

کچھ یزیدوں کی مہربانی سے ہو گیا شہر کربلا کی طرح

ہم ایسے لوگوں سے پوچھو حیات وموت کا فرق
یزیدیوں میں جو اِبن بتول بن کے رہے

اک روشن تاریخ بنانی پڑتی ہے
ہر پیاسا تو امام نہیں ہوتا جاناں

یزید وحُر ملا وشمر کے مقابل میں
ہمیں حسین کا کردار بھی عطا کردے

مبادا جنگ کا اعلان ہم نے
کوئی جیتے کہ ہارے کردیا ہے

کسی نے ہار کر اعلانِ بیعت
کسی نے ڈر کے مارے کر دیا ہے

یہی ہے ایمان کی کسوٹی
پلٹ کے شہادت کی طرف آ

عقیل شاداب کی شاعری سرقہ وتوارد سے بَری ہونے کے باعث انفرادی ہونے کے ساتھ ساتھ افادی ہونے کا اعزاز بھی رکھتی ہے۔ یہ وہ شاعری ہے جس پر کسی کورانہ تقلید کا لیبل چسپاں نہیں ہوتا۔ یہ بات الگ ہے کہ اُن کے اکثر معاصر شعراء نے قدامت وروایت کی پگڈنڈیوں کو چھوڑ کر جدّت طرازی کی شاہراہوں پر اپنا شاعرانہ سفر کرتے ہوئے اسی سے ملتا جلتا لب ولہجہ اختیار کیا اور تبدیلیوں اور تغیرات سے چشم پوشی کے بجائے اُن کا خیر مقدم کیا۔ عقیل شاداب نے انہیں شعراء کے ہمراہ مسافتِ سخن کا کارواں آگے بڑھایا، تاہم اُن کی شاعری میں لفظوں کا عرفان جذبات واحساسات کا طوفان بن کر نہیں بلکہ چمبل کی چنچل لہروں کی طرح رواں دواں روش اختیار کیے ہوئے نظر آتا ہے۔ اور حق تو یہ ہے کہ اسی روش نے انہیں نہ صرف ہندوستان بلکہ برِّصغیر کے ادبی حلقوں میں شہرت ومقبولیت دلائی ہے۔ آیئے اب اُن اشعار سے بھی روبرو ہولیا جائے جنھوں نے شاداب صاحب کے گلشنِ سخن کی آبیاری وسیرابی کا فریضہ انجام دیا۔ شاید ہی کسی ناقد کو اس بات سے انکار ہو کہ شاداب کی ادبی پہچان قائم کرانے میں یہ شعری تخلیقات ممد ومعاون ثابت ہوئیں۔ یعنی : ؎

یہ سچ ہے میرا روایت پہ انحصار نہیں
لکیر پیٹتے رہنا مرا شعار نہیں

میں نے جس کے لئے چھپوائی غزل
اُس کو دلچسپی ادب سے کم ہے

اب تو لہجے کا بھی دم گھٹنے لگا
کیسی پابندی لگی اظہار پر

یہ کیسا شور شرابہ ہے میرے آنگن میں
یہ لوگ بیچ میں دیوار کیوں اُٹھاتے ہیں

اُس کے دستِ حنائی پر میری
انگلیوں کا دباؤ روشن ہے

دھوپ کے دشت بے اماں میں کبھی
موم کے گھر نہیں ہوا کرتے

دیمک چاٹ چکی ہے مجھ کو اندر تک
درج میں پھر بھی خواہش کے صفحے میں ہوں

جانے پڑھ کر اُس کے دل پر کیا گزرے
شعر میں شاداب سماتے ڈرتا ہوں

بڑھ کر اُسے صحراؤں نے سینے سے لگایا
ندیا وہ سمندر سے جو ملنے کو چلی تھی

کس پہ کرو شادابؔ بھروسہ آئینہ بھی بے چہرہ ہے

کب سے بجھی ہوئی ہے مری مشعلِ وجود اپنے بدن کی آگ سے روشن کرو مجھے

مٹّی،کستوری،صندل اور تلسی کی مہک سے معطر عقیل شادابؔ کی شاعری نے اذہان کو ہمیشہ تر و تازگی بخشی اور ایسی فضا ہموار کی جو دلوں کو کدورت سے صاف و شفاف کرنے کا مطالبہ کرتی ہے۔انہوں نے سلیقے مندی سے اپنے اندازِ خاص میں کہا ہے کہ:

بسی ہوئی ہے تلسی کی خوشبو گھر میں رچا ہوا ہے روپ سلونا ماٹی کا

کستوری سی مہک رہی ہے چاروں اور چھان رہا ہوں کونا کونا ماٹی کا

زلف جھرنے کی طرح، جسم ہے صندل کی طرح ایک جادو ہے ترے حسن میں جنگل کی طرح

تنہا پیڑ ہوں میں شادابؔ بیاباں میں گھرا ہوا سانسوں میں صندل ہے اپنا

''بے آب سمندر'' کی غزلیات بے اثر، بے رونق، بے زیب و زینت اور بے راہ وروی کا شکار نہیں ہیں۔یہ غزلیات اُس وقت تخلیقی عمل سے گزریں جب خطۂ راجستھان کے اکثر و بیشتر شعراء ''جدیدیت'' کو ایک وبا سمجھ کر اس سے فاصلہ گھٹانے اور قربت بڑھانے میں کشمکش اور تذبذب محسوس کر رہے تھے لیکن عقیل شادابؔ کے فکر و عمل پر علامہ اقبالؔ کا یہ فرمان صادق آتا ہے کہ ''بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق'' آمدم برسرِ مطلب ''بے آب سمندر'' کی تخلیقات محض خام خیالی پر مبنی نہ ہو کر حقیقت، صداقت اور ارضیت سے گہرا تعلق رکھتی ہیں اور اسی لئے اُنہیں فکر و فن اور شعر و سخن کی معراجِ کمال کا درجہ و اعزاز حاصل ہے۔

☆☆☆☆☆

(صفحہ نمبر ۱۰ سے آگے)

جناب آقائی دلؔ ایوبی تونکی بر وفات حسرت آیات حضرت صولتؔ فرمود

جب تک اردو ہے رہے گا حضرت صولت کا نام کون ہے جو بھول جائے گا بھلا ان کا کلام

کوئی چاہے بھی تو لے نہیں سکتا ان کا مقام ان کے فن سے جا نہیں سکتا کبھی رنگ دوام

این شخصیت ارجمند و اعلیٰ آقائی صولتؔ در حقیقت چنان خدمات عظیم الشان و ارزنده ای در زمینه زبان و ادب فارسی و اردو نمود که مصداق این شعر حافظؔ شیرازی گشت:

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

ایزد متعال بی جنت الفردوس مقام اعلیٰ عطا کنا و بمنہ و کرمہ

ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم و تب علینا انک انت التواب الرحیم ربنا آمنا فاغفر لنا وا رحمنا وانت خیر الراحمین بر حمتک یا ا رحم الراحمین والحمد للہ رب العالمین

☆☆☆☆☆

علی جواد زیدی کے رثائی متون: ایک تنقیدی جائزہ

ڈاکٹر عابد حسین حیدری

صدر شعبۂ اردو۔ پرنسپل

ایم جی ایم، پی جی کالج، سنبھل (یوپی)

صنف مرثیہ ہمارے تہذیبی ورثہ کا وہ گراں قدر سرمایہ ہے جو ہماری دیگر اصناف سخن کے مقابل ناقدین ادب کی بے توجہی کا شکار رہا ہے۔ بھلا ہو علامہ شبلی نعمانی کا جنھوں نے ''موازنۂ انیس و دبیر'' لکھ کر اس صنف کی ادبی حیثیت کی طرف توجہ دلائی جبکہ مولانا محمد حسین آزاد اور حالی نے شبلی سے قبل اس کی فنی عظمت کا اعتراف کیا تھا لیکن اردو ادب کی باوقار صنف سخن ہونے کے باوجود نہ جانے کیوں نام نہاد صاحبانِ نظر اور نقادوں کی توجہ اس صنف سخن پر نہیں ہے۔ مرثیہ تنقید پر آج بھی بہت کم لکھا جا رہا ہے اور جن لوگوں نے اس پر لکھا انھوں نے فن پر کم اس کی اعتقادی اہمیت اور جواب الجواب پر زیادہ زور صرف کیا۔

علی جواد زیدی ہمارے ان محققین و ناقدین میں سے ایک ہیں جنھوں نے اپنی ادبی زندگی کی شروعات بحیثیت شاعر کے کی تھی لیکن ترقی پسندی کے غلغلہ سے نکل کر انھوں نے سنجیدہ موضوعات پر قلم اٹھایا اور دو ادبی اسکول، اردو میں رام کتھا قصیدہ نگاران اتر پردیش، مثنوی نگاری، تاریخ ادب اردو کی تدوین، ہسٹری آف اردو لٹریچر، میر انیس، جدید مرثیے کے بانی میر ضمیر، دہلوی مرثیہ گو اور تاریخ مشاعرہ جیسے موضوعات کے ساتھ ساتھ رثائی ادب کے مختلف زاویہ پر کام کر کے اردو ادب کے ناقدین و محققین کی توجہ کا مرکز بنے۔ رثائی ادب میں میر انیس، میر ضمیر، انیس کے سلام، رباعیات انیس اور دہلوی مرثیہ گو (دو جلدیں) ان کے ایسے کارنامے ہیں جن سے رثائی تنقید میں ان کی حیثیت مسلم ہو جاتی ہے۔ ان کے رثائی متون نے مرثیہ تنقید میں اپنے وژن اور فکر کے ذریعہ مرثیہ کے تعلق سے ان غلط فہمیوں کا ازالہ کیا جس سے عدم مطالعہ کے سبب ہمارے بہت سے ناقدین آج بھی مرثیہ کی افادیت کے منکر ہیں اور پرانی روش پر گامزن رہتے ہوئے مرثیہ کی ادبی حیثیت سے منہ موڑے ہوئے ہیں۔ لیکن علی جواد زیدی کے رثائی متون کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ انھوں نے رثائی ادب خصوصاً مرثیہ تنقید پر بہت اہم کارنامے انجام دیے ہیں۔ انھوں نے اردو ادب کے مختلف پہلوؤں کو نہ صرف اردو داں طبقہ تک پہنچایا بلکہ انگریزی زبان میں اپنی تصانیف کے ذریعہ اردو شاعروں اور ادیبوں کی سوانح کے ساتھ ساتھ اردو ادب کی مبسوط تاریخ بھی لکھی۔ انگریزی میں ان کی ''تاریخ ادب اردو'' کو قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا، اس لیے کہ یہ تاریخ سائنٹفک طریقۂ کار اپناتے ہوئے تحریر کی گئی ہے۔ ''تاریخ ادب اردو'' کے ساتھ ساتھ ساہتیہ اکادمی دہلی سے علی جواد زیدی نے اردو کے عظیم شاعر میر انیس پر انگریزی میں کتاب تحریر کی۔ بعد میں اس کا اردو ترجمہ زیدی نے خود ہی کیا۔ انھوں نے میر انیس کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے ''میر انیس'' کے پیش لفظ میں لکھا:

> ''اردو کے عظیم شاعروں کے جگمگاتے کارواں میں بھی انیس کا شمار صف اول کے قدآور فنکاروں میں ہوتا ہے...... مرثیہ گویوں کے طبقے میں بھی انھیں ہم سفروں پر اس لیے سبقت حاصل ہوئی کہ انھوں نے تجربہ وانحراف کے ایسے نئے اور فعال رجحان کی ابتدا کی جس کا اثر نہ صرف اس صنف پر دیرپا ثابت ہوا بلکہ اس سے دوسرے اصناف سخن بھی متاثر ہوئے۔''[۱]

علی جواد زیدی مرثیہ کو اردو کی بلند ترین صنف تسلیم کرتے ہیں اور یہ صنف انیس و دبیر کے یہاں بہ حیثیت فن نقطۂ عروج پر پہنچ جاتی ہے۔

موصوف کا خیال ہے کہ انیس و دبیر میں انیس عظیم تر اور زیادہ فطری شاعر ہیں ساتھ ہی انھوں نے میر اور غالب کی عظمت کا بھی اعتراف کیا ہے۔ انھوں نے لکھا:

''آج کا سوچا سمجھا ہوا ادبی فیصلہ غالبًا یہ ہوگا کہ انیس، غالب اور میر اس زبان کے سب سے بڑے شاعر ہوئے ہیں۔انھوں نے الفاظ کا بہت بڑا ذخیرہ استعمال کیا ہے پھر بھی ان کا اسلوب سادہ، رواں اور آسان ہے۔ان کا خاندان خالص اور بامحاورہ اردو لکھنے کے لیے مشہور ہے۔ان کی قوت بیانیہ حیرت انگیز ہے۔ اس کا بہترین مظاہرہ انسانی جذبات، بالخصوص رنج وملال، بہادری، مناظر قدرت اور جنگ کے اظہار بیان میں ہوا ہے۔''۲؎

انیس نے جس زمانے میں شاعری شروع کی اردو میں اخلاقی شاعری کا فقدان تھا۔غنائی غزل اور بیانیہ مثنوی اپنے تمام تخلیقی امکانات کھو چکی تھی۔انیس نے غزل اور مثنوی جیسی منجمد اصناف سخن سے پرے نئے مرثیے کی طرف رخ کیا اور اردو شاعری کی نئی وسعتوں سے آشنا کیا۔انھوں نے مرثیے کو ادب میں ایک مستقل جگہ بنانے کی طرف راہ ہموار کی، اس کے متعین حدود میں توسیع کی اور اس کو نئی آرائشیں اور سمتیں عطا کیں۔اس صورت حال کی عکاسی کرتے ہوئے علی جواد زیدی رقم طراز ہیں:

''مرثیے کے رثائی مزاج کی وجہ سے اس صنف میں تجربے کی گنجائش بہت محدود تھی لیکن انیس ایک وسیع النظر فنکار تھے۔انھوں نے ان حد بندیوں پر پوری طرح قابو پالیا اور نئی شاعری کی وسعتوں کے ایک پورے سلسلے کا ڈھانچہ تیار کیا۔''۳؎

ٹی گریہم بیلی نے "A history of urdu literature" میں صنف مرثیہ اور انیس و دبیر کی عظمت کا اعتراف کیا ہے اور بیلی کے ہم نوا رام بابو سکسینہ اور محمد صادق جیسے صاحبان نظر بھی نظر آتے ہیں۔بیلی کا خیال ہے کہ مرثیہ اردو شاعری کی بلند ترین صنف ہے اور انیس و دبیر کے یہاں نقطۂ عروج کو پہنچ جاتی ہے۔ان دونوں میں انیس عظیم تر اور زیادہ فطری شاعر ہیں۔بیلی کی اس آواز پر لبیک کہنے والوں میں حالی اور شبلی جیسے ناقدین بھی ہیں۔حالی نے تو مقدمہ شاعر وشاعری۴؎ میں یہاں تک لکھ دیا کہ ''ہمارے قصائد کی حالت تو ناگفتہ بہ ہے۔البتہ ہمارے مرثیے نے ایک خاص قسم کی نمایاں ترقی ظاہر کی ہے۔'' حالی میر انیس کے صرف ناقد ہی نہیں ہیں بلکہ ان کی تنقید مداحی تک پہنچ جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ وہ انیس کے سحر سے باہر نہیں نکل سکے اور انھوں نے لکھا کہ ''میر انیس نے اس طرز کو معراج کمال تک پہنچا دیا۔اردو شاعری میں جو کہ مدت سے بے حس وحرکت پڑی تھی تموج بلکہ تلاطم پیدا کر دیا......انھوں نے بیان کرنے کے لیے نئے نئے اسلوب اردو شاعری میں کثرت سے پیدا کیے۔ایک ایک واقعے کو سو سو طرح سے بیان کرکے قوت متخیلہ کی جولانیوں کے لیے ایک نیا میدان صاف کر دیا۔'' علی جواد زیدی نے ''مقدمہ شعر وشاعری'' میں حالی کی مرثیہ تنقید پر سیر حاصل بحث کی ہے اور مرثیہ کی اخلاقیات پر حالی کی رائے پر خراج تحسین پیش کیا ہے۔انھوں نے حالی کی مرثیہ تنقید پر سیر حاصل گفتگو کرتے ہوئے درج ذیل نتیجہ اخذ کیا ہے:

''حالی کی تنقید میں مرثیہ گوئی کی حیثیت سے انیس کا پلہ بہت بھاری ہے، پھر بھی اخلاقی عنصر کی گفتگو آنے پر انھوں نے دوسرے مرثیہ نگاروں کا بھی ذکر کیا ہے۔''۵؎

علی جواد زیدی نے حالی اور آزاد کی مرثیہ تنقید پر قدرے تفصیلی بحث کی ہے۔آزاد کے انیسیے اور دبیر یے کے مباحث پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ آزاد نے لکھا ہے کہ ''انیسیے''انیس کی صفائی کلام،حسن بیان،لطف محاورہ اور سہل ممتنع کو بے نظیر بتاتے اور''دبیریئے''شوکت الفاظ،بلند پروازی اور تازگی مضمون کو بے مثل سمجھتے تھے۔آخر میں فیصلہ انصاف پر چھوڑا۔آزاد کا خیال ہے کہ دونوں ہی اچھے ہیں،بعض اوقات بعض پہلوؤں سے ایک آگے بڑھ جاتا ہے اور کبھی دوسرا۔علی جواد زیدی نے لکھا ہے کہ''آزاد نے زبان کے معاملے میں انیس اور ان کے گھرانے کی زبان کو مستند اردوئے معلیٰ قرار دیا۔دبیر کے ترجمے کے سلسلے میں آزاد نے انیس کی خوبی بندش،حسن اسلوب،مناسبت مقام،طرز ادا اور سلسلہ کی ترتیب کی بھی داد دی ہے اور کہا ہے کہ ان خوبیوں میں ان کا جواب نہیں تھا۔''[۶]

محمد حسین آزاد نے مرثیے میں المناکی اور دلگدازی اصل چیز قرار دیا ہے۔ان کا خیال تھا کہ انیس و دبیر کے زمانے میں رزم و بزم کا جو اضافہ ہوا،اس سے مرثیے کا میدان بہت دور رہ گیا۔اور افسوس کہ اصل مدعا وہی تھا۔علی جواد زیدی نے اس نکتے پر بحث کرتے ہوئے آزاد اور حالی کے نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا:

> ''آزادؔ حالی سے کوئی تیرہ برس پہلے یہ تنقید لکھ رہے تھے،لیکن ایک بنیادی فرق یہ تھا کہ وہ مرثیے کو صرف قصیدہ کی توسیع نہیں، بلکہ ایک الگ صنف سمجھتے تھے،جس کی علت غائی یہ تھی کہ سننے اور پڑھنے والے کے دل کو اندر سے مسوس دے اور رونے رلانے پر مجبور کردے۔''
>
> حالی کے خیال میں مرثیہ اور قصیدہ میں فرق صرف یہ تھا کہ قصیدہ زندہ کی تعریف تھا اور مرثیہ متوفی کی۔آخر الذکر میں تاسف اور افسوس بھی شامل ہوتا تھا۔''[۷]

حالی نے آگے چل کر یہ بھی تنبیہ کی ہے کہ مرثیے کا مقصد صرف رونا رلانا نہیں ہونا چاہیے لیکن علی جواد زیدی نے حالی کے اس نظریہ سے اختلاف کرتے ہوئے میر انیس کے ایک مصرع:

مرثیہ درد کی باتوں سے نہ خالی ہووے

کو اپنی بات کی تطبیق کے لیے پیش کیا ہے ساتھ ہی اس بات کی بھی وضاحت کی ہے کہ انیس مرثیے میں درد کی باتوں کو مرثیہ کا جز و لازم قرار دینے کے باوجود دوسرے اجزائے مرثیہ کی نفی نہیں کرتے۔انھوں نے لکھا ہے کہ:

> ''انیس درد کی باتوں کو مرثیے کا جزو لازم قرار دینے کے باوجود دوسرے اجزا کی نفی نہیں کرتے بلکہ ان کا جواز پیش کرتے ہیں۔مرثیے اور خالص بین میں جو موت کے گریہ وفریاد آمیز ذکر سے دلوں پر فی الفور اثر کرتا ہے،صنفی اعتبار سے فرق ہے۔درد کی باتوں کا ذکر دونوں میں لازمی ہے۔بین ہر مرثیے کے آخر میں ضرور آتا ہے،اس لیے بنیادی طور سے مرثیہ مرثیہ ہی رہتا ہے۔''[۸]

علی جواد زیدی نے اجزائے مرثیہ پر تفصیلی بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انیس کا فنکارانہ کمال یہ ہے کہ وہ رزم بزم کا بیان اس طرح کرتے ہیں کہ ان کے یہاں رثائی فضا مجروح ہوتی ہوئی محسوس نہیں ہوتی اسی لیے علی جواد زیدی''نیا مرثیہ''کو جو انیس کے ذریعہ تخلیق کیا جا رہا تھا اس میں صرف گریہ وزاری نہیں بلکہ جرأت و ہمت کا پیغام بتاتے ہیں ساتھ ہی رزمیہ کا عنوان بھی۔انھوں نے انیس کو عظیم تر شاعر قرار دیتے ہوئے لکھا:

''انیس جیسے فنکار اس کا اہتمام کرتے ہیں کہ رزم یا بزم کا بیان اس طرح نہ ہو کہ رثائی فضا ہی مجروح ہو جائے۔''

علی جواد زیدی نے ''میر انیس'' میں آزاد کے اس خیال سے کہ'' مرثیوں میں رزم و بزم کی گنجائش نہیں'' سے اختلاف کیا ہے۔ان کا خیال ہے کہ آزاد کے اس خیال پر عربی اور فارسی مراثی کی تا ٔسی کا جذبہ غالب ہے۔وہیں زیدی علامہ شبلی نعمانی کی مرثیہ تنقید کے مداح نظر آتے ہیں۔انھوں نے شبلی نعمانی کے''موازنۂ انیس و دبیر'' کو اہم تصنیف قرار دیتے ہوئے حالی اور آزاد کے مقابل ان کے نقطۂ نظر کی داد دی ہے۔انھوں نے لکھا:

''موازنہ کا یہ کارنامہ ہے کہ اس میں پہلی بار انیس اور دبیر کا تقابلی مطالعہ تفصیل سے کیا گیا۔اس مشہور تصنیف میں شبلی نے جائز طور سے انیس کو دبیر پر ترجیح دی اور انہیں بہتر شاعر اور فنکار قرار دیا ہے۔موازنۂ انیس و دبیر کی اشاعت سے ایک گرما گرم ادبی مناظرہ چھڑ گیا اور اس کی موافقت و مخالفت میں کئی کتابیں نکلیں،لیکن حق یہ ہے کہ شبلی کی تصنیف آج بھی بڑی اہمیت کی حامل ہے۔''۹

شبلی نعمانی نے میر انیس کے کلام کو شاعری کی تمام اصناف کا بہتر نمونہ قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ اور کسی دوسرے شاعر نے اپنے کلام میں اتنے اصناف سے کام نہیں لیا ہے۔محمد حسین آزاد کے مقابل شبلی کو زیدی بہتر نقاد مانتے ہیں۔ان کا خیال ہے کہ''شبلی کے مقابلے میں محمد حسین آزاد کے یہاں گومگو کی حالت ہے اور وہ فیصلہ نہیں کر پاتے کہ دونوں میں کس کو چنیں۔''علی جواد زیدی کے مطابق'' آزاد کو جس خصوصیت نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ انیس اور ان کے مدمقابل کی یہ تخلیقی صلاحیت تھی کہ ایک ہی طرح کی صورت حال کو ہر مرثیے میں ایک نیا رنگ دے سکتے تھے۔خاص کر، مناظر فطرت کی عکاسی آزاد پر جادو کر دیتی تھی۔'' زیدی نے لکھا ہے کہ''شبلی کی نگاہوں میں انیس کا اہم کارنامہ یہ ہے کہ اردو شاعروں میں سب سے بڑا ذخیرۂ الفاظ استعمال کرنے کے باوجود، وہ شاید ہی کوئی ایسا لفظ یا بندش استعمال کرتے ہوں جو موزوں نہ ہو۔''شبلی کے خیالات کو علی جواد زیدی اپنی لفظیات میں کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں:

''انیس مختلف واقعات کا بیان کرتے وقت اپنی لفظیات اور اسلوب میں اس ہوش مندی سے تبدیلیاں کرتے چلتے ہیں کہ یہ بدلتے ہوئے ماحول اور کیفیات سے کلیتاً ہم آہنگ ہو جاتے ہیں۔وہ سانحۂ کربلا سے متعلق سیکڑوں واقعات بیان کرتے ہیں مگر شاعرانہ حقیقت پسندی کو مجروح نہیں ہونے دیتے۔''۱۰

علی جواد زیدی نے اپنی تصنیف''میر انیس'' میں مولانا ابوالکلام آزاد، رام بابو سکسینہ،سید احتشام حسین اور آل احمد سرور کے اقوال سے انیس کی شاعرانہ عظمت کو واضح کیا ہے۔انھوں نے مولانا ابوالکلام آزاد کے مشہور قول''غالب کی غزل اور انیس کا مرثیہ عالمی ادب کو اردو شاعری کی دین ہیں۔'' پر آل احمد سرور کے اس قول کو اضافہ قرار دیا ہے کہ'' شاعری کے سارے معیاروں پر انیس پورے اترتے ہیں اور ان کی شاعری میں عظمت اس لیے ہے کہ وہ زندگی کی بعض بڑی قدروں کے علمبردار ہیں۔ یہ قدریں اعلیٰ اخلاقی قدریں ہیں۔'' علی جواد زیدی نے کلیم الدین احمد اور ڈاکٹر محمد صادق کے نظریات کو بھی اپنی بحث کا حصہ بنایا ہے۔انھوں نے ان کے نظریات سے اختلاف کرنے کے باوجود اس سے صرف نظر کو مناسب نہیں سمجھا۔ان کی یہ فکر انھیں متوازن نقاد کی صف میں کھڑا کرتی ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''پروفیسر کلیم الدین احمد اور ڈاکٹر محمد صادق بنیادی طور پر انگریزی ادب کے رسیا ہیں اور انھوں نے اردو

ادب کے ناپنے کے پیمانے خالص مغربی بلکہ انگریزی ادب سے براہ راست مستعار لیے ہیں،لیکن یہ تنقیدی اصول ونظریات مغربی زندگی، وہاں کے سماجی ماحول اور مزاج کی پیداوار ہیں اورانھیں حرف بہ حرف اردو پر منطبق کرنے کی ہر کوشش ناقدانہ احتیاط کی کمی پر محمول کی جائے گی، یہی ان کی افتادِطبع ہے، پھر بھی اس سے اغماض نامناسب ہے۔''۱۱

علی جوادزیدی نے اپنی تصنیف''میر انیس'' کو پانچ ابواب میں منقسم کیا ہے۔

پہلا باب''تاریخی پس منظر'' کےعنوان سے ہےجس میں مرثیہ، خاندان، میرضاحک، میرحسن، میرخلیق اورلکھنؤ کی سرخی سے ذیلی عنوانات قائم کیے ہیں۔دوسراباب''حیات'' کےعنوان سے ہے،جس میں میرانیس کی تعلیم ،فوجی مشقیں، پہلی جھلک، پہلی مرثیہ خوانی لکھنؤ میں سکونت، انیس اور دربار، دوسری مجلسیں، پٹنہ، حیدرآباد، دوسرے مقامات پر، شاہ نجف کا وظیفہ، طرزخواندگی، انفرادی کردار، آخری مجلسیں، اندازمرثیہ گوئی اور آخری ایام کےعنوانات کےتحت ذیلی سرخیاں ہیں جن پرانھوں نےمعلومات فراہم کی ہیں۔تیسراباب''کرداراورفن'' کےعنوان سے ہے جواس کتاب کا مرثیہ تنقید کے حوالے سے سب سے اہم باب ہے۔اس باب میں زیدی نے شاگرد، تصانیف، انیس کافن، انسانی نفسیات سے باخبری، آفاقیت، انحرافات، داخلی وحدت، نئے تجربے، جنگ کے مناظر، سلام اوررباعیاں کےعنوانات سے تحقیقی وتنقیدی بحث کی ہے۔ چوتھا باب ''اختتامیہ'' کےعنوان سے ہے۔ پانچواں باب''انتخاب مرثیۂ انیس''اورآخرمیں''کتابیات'' کی فہرست شامل ہے۔انھوں نے''اختتامیہ'' میں انیس کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا:

''جدید ہندوستانی ادب کے معماروں میں انیس ایک مثالی شخصیت کے مالک ہیں۔انھوں نے اردوکو ہندوستانی عناصر سےجس طرح مالامال کیاوہ اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔انھوں نے کربلا کی دل گداز داستان کوآفاقی جہات سے آشنا کرایااوراپنےعظیم فن کی بدولت اس داستان کو ہندوستانی ادبیات کا ایک جزو بنادیا۔انھوں نے محاوروں اور بول چال کے روزمروں کا ایک بڑاذخیرہ وراثت میں چھوڑا، جو ہندی اورمتعلقہ زبانوں اور بولیوں میں رچ بس گئے تھےلیکن جنھیں ادب میں جگہ کم ملی تھی۔انھوں نے ہندوستانی فن ڈرامہ اورادب کوایک نئی اور جاندار صنف عطا کی۔اردوکوان کی اس دین کو ہم رثائی رزمیہ کا نام دے سکتے ہیں لیکن یہ بھی ان کے مجموعی اکتسابات کا صرف نامکمل طور سے احاطہ کرے گا۔ان کا سب سے بڑا کارنامہ وہ طاقت وتوانائی ہے جومرثیوں کے ذریعہ مسدس کوعروضی ہیئت کوحاصل ہوئی۔''۱۲

علی جوادزیدی کی دوسری اہم کتاب''جدید مرثیے کے بانی ضمیرلکھنوی'' ہے، جسے مصنف نے خود۱۹۹۸ءمیں یونائیٹیڈ پریس لکھنؤ سے شائع کیا ہے۔اس کتاب کی ترتیب وتنظیم میں راقم الحروف زیدی کا معاون رہا۔دراصل اس کتاب کی ابتدا''نیادورلکھنؤ'' میں ایک مضمون سے شروع ہوتی ہےاوراس مضمون پرڈاکٹرمسیح الزماں نے اپنی تصنیف''اردومرثیے کاارتقا'' میں چندشبہات کاذکرکیا۔بعد میں پروفیسراکبرحیدری کاشمیری نے اپنےتحقیقی مقالہ''اودھ میں اردومرثیے کاارتقاء'' میں ڈاکٹرمسیح الزماں کےشبہات کی روشنی میں بحث کوآگے بڑھایااوربعد میں میرضمیر پرایک مبسوط کتاب شائع کی۔بعد میں زیدی نےعلی گڑھ اوررام پور سے مزید معلومات کی بنیاد پراپنے موقف کی مزید وضاحت کی اورنئی دہلی کے جریدۂ تحریر میں

سلسلۂ مضامین کی شکل میں شائع کیا۔زیدی کے قیامِ ممبئی ۱۹۹۱ء میں دو ماہی ''العلم'' کی اشاعت سے یہ سلسلۂ مضامین نئے معلوماتی ذخائر کی روشنی میں متعدد قسطوں میں شائع ہوئے اور واپسی ممبئی پر لکھنؤ سے مصنف نے اسے کتابی شکل میں شائع کیا۔مذکورہ کتاب میں زیدی نے میر ضمیر کی مرثیہ نگاری اور تاریخ مرثیہ میں ان کے مقام کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔انھوں نے متعدد منابع سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ میر ضمیر ہی جدید مرثیے کے موجد یا بانی ہیں۔انھوں نے آغاز کلام میں لکھا ہے:

''جدید مرثیے کے ابتدائی نقوش ایک تنظیم وترتیب کے ساتھ میر مظفر حسین ضمیر لکھنوی کے یہاں نمایاں ہوئے۔یہی داستان اس کتاب میں کسی قدر شرح وبسط کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔''[۱۳]

علی جواد زیدی نے مذکورہ کتاب کو مختلف مرحلوں سے گزارا ہے۔آغاز کلام کے بعد انھوں نے ''مرثیہ میر ضمیر سے پہلے'' کی سرخی کے تحت ضمیر سے پہلے اردو مرثیہ کی صورت حال کا جائزہ پیش کیا ہے۔''ابتدائی حالات'' کے تحت انھوں نے ولادت،تعلیم،شاعری،شاگردی،مرثیہ خوانی کا آغاز،داستان گوئی،مثنوی خوانی،مرثیہ گوئی پر معلومات فراہم کی ہیں۔متذکرہ کتاب کے دوسرے حصے میں ''مرثیہ میں نئی رو'' کے تحت سراپا نگاری، منظر نگاری،رزم،آمد وصف آرائی،رجز،صفت تیغ،صفت اسپ،دست بدست جنگ،جنگ اور انفرادی شان جیسی ذیلی سرخی کے تحت بحث کرتے ہوئے انفرادی جنگ کے بطور امام حسین کی جنگ،جناب عباس کے جنگ کے طریقۂ کار اور حضرت حر کی جنگ کی انفرادیت کو بطور مثال پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ شہادت،مقامی رنگ،مرثیہ اور اخلاقیات،عام اخلاقی پہلو،ناپائیداری حیات اور مقامات عشق جیسے موضوعات پر ضمیر کی برتری اور ان کی فنکارانہ عظمت کو ثابت کیا ہے۔مرثیہ خوانی کا نیا طریقہ،معاصرانہ چشمک،دبیر حلقۂ تلامذہ میں اور دبیر سے رنجش اور صفائی کو بھی کتاب میں واضح کیا گیا ہے۔

میر ضمیر جہاں مرثیے کے بڑے اور اہم شاعر ہیں وہیں مثنوی نگار کی حیثیت سے ان کا بڑا مقام ہے۔انھوں نے عشقیہ مثنویوں کے ساتھ ساتھ مذہبی اور اعتقادی مثنویوں میں بھی اپنے فن کے جوہر دکھائے ہیں۔زیر نظر کتاب میں انھیں بحیثیت مثنوی نگار ایک اہم اور بڑا شاعر پیش کیا گیا ہے۔متفرقات کے ذیل میں غزل،رباعی،سلام،تضمین ونوحہ چہاردہ بند اور قصیدوں پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔آخر میں زیدی نے شاگرد،محسنین، اولاد،شاگرد اور میر ضمیر کی وفات کے بارے میں معلومات فراہم کی ہیں۔مذکورہ کتاب میں دو عنوانات اہمیت کے حامل ہیں جو مرثیہ تنقید میں اہمیت کے حامل ہیں۔''مرثیہ میں نئی رو'' اور ''مرثیہ خوانی کا نیا طریقہ'' ان دونوں عنوانات کے تحت زیدی نے اردو مرثیہ میں میر ضمیر کی انفرادیت ثابت کی ہے۔اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ میر ضمیر نے اردو مرثیے کا نیا ڈھانچہ تیار کر کے اپنی زندگی ہی میں لوہا منوایا اور مرثیے کے حوالے سے اردو ادب کو نئے رنگ وآہنگ سے روشناس کرایا۔انھوں نے سودا کے بعد مرثیے کو اعلیٰ ادبی صنف بنانے کی سعی کی اور اس کو عربی،فارسی کی کورانہ تقلید سے بچا کر اس کو عوامی سطح سے بہت بلند کر کے اسے ایک اعلیٰ ادبی صنف کا درجہ دلایا۔اس ضمن میں علی جواد زیدی رقم طراز ہیں:

''میر ضمیر نے مرثیوں کا نیا ڈھانچہ تیار کر کے اور اپنی زندگی ہی میں اس کا لوہا منوا کے اردو ادب کو نئے آفاق سے روشناس کرایا......انھوں نے مرثیوں کو روایت وحدیث کی تنگنائے سے باہر نکالا اور مذہبی ہستیوں کے کردار کو انسانی عظمتوں کے پیکر میں پیش کیا۔سب سے بڑھ کر یہ کہ واقعۂ کربلا جو عربی اور فارسی میں صرف رثائیت پیدا کرنے کا ذریعہ تھا،اردو میں جوش مردانگی،حمیت ملی،فرض شناسی،قربانی وشہادت جیسے اہم جذبات کی ترویج

کا وسیلہ بن گیا۔''۱۴؎

علی جواد زیدی کا خیال ہے کہ میر ضمیر کے دور میں مرثیہ اپنی ادبی حیثیت منوا چکا تھا۔ انھوں نے اس وقت کی مروجہ اصناف سخن کا تجزیہ کرتے ہوئے بتایا ہے کہ اس وقت کے اہم شعرا غزل گوئی کو ترک کر کے مثنوی نگاری کے ساتھ مرثیہ نگاری کو بھی اپنا رہے تھے۔ وہ لکھتے ہیں:

''میر ضمیر کے دور تک آتے آتے غزل اور قصیدہ دونوں ہی بے جان اصناف بن چکے تھے۔ تازہ گوئی، تمثیل اور صنائع بدائع کے نام پر اب بھی کچھ لوگ ہاتھ پاؤں مار رہے تھے، لیکن ان اصناف سخن کے لیے خصوصی اور کلی انہماک ویسے بھی زیادہ دنوں تک باقی نہیں رہ سکتا تھا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ مثنویوں کی طرف پھر توجہ بڑھ رہی تھی اور لوگ غزل گوئی ترک کر کے مثنوی نگاری اور مرثیہ نگاری وغیرہ کی طرف راغب ہونے لگے تھے۔''۱۵؎

اپنی گفتگو کی مزید وضاحت کرتے ہوئے علی جواد زیدی مرثیہ کے اہم ادبی صنف بننے کی صلاحیت کا ذکر کرتے ہوئے اس کا سہرا میر ضمیر کے سر باندھتے ہیں۔ انھوں نے لکھا:

''ان اصناف کے مقابلے میں، انھیں اصناف کی آغوش میں پرورش پانے والی صنف مرثیہ تھی، جو سودا، میر کے بعد رفتہ رفتہ ایک اہم ادبی صنف بننے کی صلاحت پیدا کرنے لگی تھی۔ اس میں میر ضمیر نے طرز جدید کی بناڈال کر، نئی جان ڈال دی اور یہ ایک توانا صنف ادب کی حیثیت سے ابھر آئی۔''۱۶؎

میر ضمیر کے ''بانی طرز جدید'' پر تفصیلی بحث کرتے ہوئے زیدی نے حالی، آزاد اور شبلی کی تنقیدی تحریروں سے استفادہ کرتے ہوئے شبلی کی تنقیدی صلاحیت کا اعتراف کیا ہے:

''میر ضمیر کے بانی طرز جدید ہونے کے بارے میں سبھی قدیم ناقد اور مورخ ادب متفق الیہ ہیں۔ حالی اور آزاد کے بعد ہمارے سامنے ایک اور قریب العہد شہادت علامہ شبلی نعمانی کی آتی ہے۔ شبلی کے ادبی وقار کی وجہ سے بھی اور اس شہادت کی تفصیلی اور عملی نوعیت کی وجہ سے بھی اس نے بیحد شہرت پائی۔ اگر ضمیر کو یہ شرف حاصل ہے کہ انھوں نے مرثیہ قدیم کو نئے سانچے میں ڈھال کر اردو کا ادبی شاہکار بننے کے مواقع پیدا کیے تو شبلی بھی اس پر جائز طور سے فخر کر سکتے ہیں کہ انھوں نے اردو مرثیہ گوئی پر پہلی مربوط اور مبسوط تنقید تحریر کی۔ خواہ مقصد صرف ''موازنۂ انیس و دبیر'' رہا ہو، لیکن انھوں نے کافی وسیع کینوس کو پیش نظر رکھا۔ اس سلسلے میں ''طرز نوی'' کی بحث اٹھ پڑی تو انھوں نے حالی اور آزاد کے خیالات سے پورا استفادہ کرتے ہوئے مزید شرح و بسط کے ساتھ اس ''طرز نوی'' میں میر ضمیر کے اکتسابات کا ذکر کیا۔''۱۷؎

زیدی نے حالی، آزاد اور شبلی کی تحریروں سے جہاں استفادہ کیا ہے، وہیں داخلی شواہد پیش کر کے ضمیر کو ''طرز نوی'' کا بانی قرار دیا ہے۔ ''طرز نوی'' کی ایجاد کے بارے میں عام طور پر ضمیر کا یہ بند پیش کیا جاتا ہے:

جس سال لکھے وصف یہ ہم شکل نبی کے　　بارہ سو انچاس تھے، ہجری نبوی کے

آگے تو یہ انداز سنے تھے نہ کسی کے اب سب ہی مقلد ہوئے اس طرزنوی کے

دس میں کہوں، سو میں کہوں، یہ ورد ہے میرا
اس طرز میں جو جو کہے شاگرد ہے میرا

اسی طرح رزم نگاری میں اولیت کو ضمیر کی مثنوی مظہرالعجائب کے درج ذیل اشعار کو دلیل بنایا ہے:

ہے ولے صد ہزار شکر خدا کہ مری طرز ہے سبھوں سے جدا
طرز یہ مرثیہ کی ٹھہرائی کہ سراپا ہو اور صف آرائی
پایا میرے کلام نے یہ رواج کہ نہیں ہے بیان کا محتاج

علی جواد زیدی نے درج بالا شواہد کی روشنی میں ضمیر کے یہاں سراپا اور صف آرائی کو طرزنوی کے اجزا میں شمار کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''میر ضمیر کے ان اقتباسات سے دو باتیں ظاہر ہو جاتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ سراپا اور صف آرائی دونوں ان کی طرزنوی کے اجزا ہیں۔ دوسرے یہ کہ لوگ ان کی حیات ہی میں ان کی اس طرز کی تقلید کرنے لگے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہم عصر مرثیہ گویوں دلگیر و فصیح و خلیق کے یہاں ایسے مرثیے مل جاتے ہیں جن میں اس طرز کی جھلک ہے۔''۱۸

علی جواد زیدی کے مطابق ضمیر مرثیوں کو حصول ثواب کے ساتھ اظہار فن کے لیے ضروری سمجھتے ہیں۔ زیدی نے اس پر تفصیلی بحث کرتے ہوئے لکھا:

''اپنے ہم عصروں میں میر ضمیر ہی وہ تنہا مرثیہ گو ہیں جنھوں نے اسی صنف کو حصول ثواب کے علاوہ اظہار علم وفن کے لیے بھی استعمال کیا اور اسے اس طرح برتا کہ یہ صنف ایک باقاعدہ ادبی صنف کا مرتبہ پا گئی۔''۱۹

زیدی نے آب حیات کے اقتباسات سے یہ ثبوت فراہم کیا ہے کہ مولانا محمد حسین آزاد مرثیے میں مرثیت کو ضرور قرار دیتے ہیں۔ آزاد کے مطابق ''میر ضمیر استعداد علمی اور زور طبع کے بازوؤں سے بلند پروازی کرتے تھے اور پورے اترتے تھے۔'' زیدی نے بھی یہ تسلیم کیا ہے کہ ''جسے آزاد نے مرثیت کا نام دیا ہے، وہ مرثیوں کی قدیم خصوصیت ہے اور سبھی مرثیہ نگار اس پر زور دیتے چلے آئے ہیں۔'' لیکن جو چیز انھیں ان کے ہم عصر مرثیہ نگاروں میں ممتاز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ انھوں نے مرثیے کی فنی ہیئت کا تعین کیا۔ حالانکہ سودا نے اس سے قبل ہیئت پر کافی کام کیا لیکن جس فنکاری سے ضمیر نے برتا وہ فنکارانہ انداز انیس و دبیر کو بھی ضمیر کی اتباع پر مجبور کرتا ہے۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے علی جواد زیدی رقم طراز ہیں:

''اس سلسلے میں انھوں نے ترتیب مضامین قائم کی۔ پہلے تمہید یا چہرہ، پھر میدان جنگ کے لیے رخصت، سراپا، میدان میں آمد، رجز خوانی، گھوڑے اور تلوار وغیرہ کا بیان۔ لڑائی، شہادت اور دعا پر خاتمہ، محاکات او رمنظر کشی بھی موقع موقع سے شامل ہوتی۔ یہی وہ ڈھانچہ ہے جسے ضمیر کے متبعین، یعنی دبیر اور انیس نے بھی برتا۔ یہ لوگ اسی عام ڈھانچے میں نئے نئے گوشے پیدا کرتے اور شعری لطافتوں کا اضافہ کرتے رہے۔''۲۰

ڈاکٹر اکبر حیدری نے اپنی تصنیف ''اودھ میں اردو مرثیے کا ارتقا'' میں میر ضمیر پر خاطر خواہ اطلاعات فراہم کی ہیں۔ بعد میں میر ضمیر پر اپنی تصنیف میں مزید اطلاعات کے ساتھ ایک ایسے مرثیے کی اطلاع بہم پہنچائی ہے جو جدید عناصر سے بھرپور ہے اور اس مرثیے میں ضمیر نے اپنا دعویٰ دہرایا ہے:

بسکہ ہر ایک کو یہ طرز سخن بھائی ہے
آج احسنت کی گردوں سے صدا آئی ہے

اسی طرز سخن کو ''طرز نوی'' کہا جا سکتا ہے، اس لیے کہ ضمیر کو بھی اس بات کا احساس تھا کہ یہ طرز سخن یا طرز نوی پسندیدہ عوام وخواص ہے اسی لیے وہ اعلان عام کرتے ہیں:

دس میں کہوں، سو میں کہوں یہ ورد ہے میرا
اس طرز میں جو جو کہے شاگرد ہے میرا ضمیر

ڈاکٹر مسیح الزماں اپنی تصنیف ''اردو مرثیے کا ارتقا'' میں اس طرز نوی کے اقراری ہیں لیکن دبی زبان میں یہ بھی کہا ہے کہ دوسرے شعراء کے یہاں بھی یہ نئے اجزا ملتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ طرز نوی کو سراپا نگاری تک محدود کر دیتے ہیں۔ علی جواد زیدی ڈاکٹر مسیح الزماں کے اس خیال سے متفق نظر نہیں آتے۔ انھوں نے لکھا:

''دراصل مسیح الزماں کے خیالات تشکیک اور بے اعتمادی کا شکار ہیں۔ میر ضمیر کے اکتسابات اتنے واضح اور پھیلے ہوئے ہیں، اتنے متنوع اور جاندار ہیں کہ اس سے انکار کرنا بھی ناممکن ہے اور یہ اقرار کرنا بھی ناگزیر ہے کہ دوسروں کے یہاں بھی یہ مثالیں کم تر پیمانے پر مل جاتی ہیں۔ ''طرز نوی'' کے موجود ہونے کا دعویٰ میر ضمیر نے بالتکرار کیا ہے، اس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ۲۱

علی جواد زیدی درج بالا لفظیات کی تطبیق شاد عظیم آبادی ۲۲، لالہ سری رام ۲۳ اور ابواللیث صدیقی ۲۴ کے اقتباسات کی روشنی میں کرتے ہوئے جہاں ''طرز نوی'' کی اولیت کا سہرا ضمیر کے سر باندھتے ہیں وہیں ابواللیث صدیقی کی اس بات کے ہم نوا بھی ہیں کہ ''لکھنوی شاعری میں اخلاقی شاعری کو مستقل حیثیت سے داخل کرنے کی یہ پہلی کوشش ہے اور کامیاب کوشش''۔ یہی وجہ ہے کہ وہ طرز نوی کی تعریف بھی متعین کرتے ہیں۔ انھوں نے لکھا:

''مختصر لفظوں میں طرز نوی یہ تھا کہ مرثیے کو خالص رثائی اور اعتقادی مضامین تک محدود نہ رکھ کر، رزم و بزم کے متعلقات بھی اسی صنف میں کلی یا جزوی طور پر التزاماً شامل کیے جائیں۔'' ۲۵

یہی وجہ ہے کہ علی جواد زیدی ضمیر کی طرز نوی کے بعد مرثیہ کو نئی صنف نظم کی نظر سے دیکھتے ہیں اور انھوں نے لکھا کہ اس طرز نوی سے مرثیوں میں نیا پھیلاؤ آیا بلکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو ایک نئی صنف نظم وجود میں آ گئی، جس کا سہرا سودا کے بعد میر ضمیر کے سر ہے، جنھوں نے بیحد معتدل اور متوازن، شگفتہ اور سنجیدہ شعری مزاج سے اپنی ہنرمندی کو ثابت کیا اور اس کے لیے خاطر خواہ داد پائی۔

زیدی نے مذکورہ تصنیف میں سراپا نگاری، منظر نگاری، رزم، شہادت، مقامی رنگ، مرثیہ اور اخلاقیات، مرثیہ خوانی کا نیا طریقہ، معاصرانہ چشمک کے ساتھ ساتھ میر ضمیر کی دیگر اصناف سخن کے حوالے سے خاطر خواہ اطلاعات پہنچاتے ہوئے سیر حاصل بحث کی ہے۔ دوسری اصناف میں

مثنوی اور غزل کے ساتھ ساتھ سلام، تضمین ونوحہ، چہاردہ بند کے نمونے پیش کر کے ان پر تفصیلی بحث بھی کی ہے جس سے ضمیر کی مذکورہ اصناف پر دسترس کا پتہ چلتا ہے۔

''انیس'' اور ''میرضمیر'' پر مبسوط تصانیف کے علاوہ علی جواد زیدی نے نعت، مرثیہ، سلام کے حوالے سے متعدد مضامین تحریر کیے ہیں۔ رثائی ادب کے دوسوسالہ یادگار انیس نمبر میں ہلال نقوی نے زیدی کے متعدد مضامین شامل کیے ہیں لیکن ''رباعیات انیس اور انیس کے سلام'' کے ذریعہ انھوں نے انیس پر معتد بہ کام کیا ہے۔ اس کے علاوہ سید فدا حسین حسینی نے زیدی کے متعدد اصناف سخن کے مضامین کو یکجا کر کے ''اصناف سخن زیدی کی نظر میں'' کے عنوان سے شائع کر دیا ہے۔

اردو کا ہر وہ شاعر جس نے مرثیے کہے ہیں سلام ضرور کہے ہوں گے اور مرثیے کی طرح سلام نے بھی رثائی ادب میں کافی مقبولیت حاصل کی۔ حالاں کہ ہمارے ناقدین نے اس کی طرف توجہ نہیں کی۔ اس سلسلے میں زیدی نے خود لکھا ہے:

> ''ہماری تاریخ ادب اور تنقید نے سارے مذہبی ادب کے ساتھ یہی سلوک کیا ہے۔ اگر قصیدے کو الگ کر دیا جائے تو مذہبی ادب کے بارے میں مشکل ہی سے ایک لفظ بھی کہیں ملے گا۔ کیا نعت، کیا منقبت، کیا مرثیہ، کیا مولود، سب سے بے اعتنائی برتی گئی اور یہ ذخیرہ جو کئی اعتبار سے اہم تھا، صدیوں طاق نسیاں کی زینت بنا رہا اور اس کا بڑا حصہ ضائع بھی ہو گیا۔'' ۲۶

صنف سلام پر سب سے پہلے امداد امام اثر نے ''کاشف الحقائق'' میں توجہ دلائی اور اس کے فنی محاسن پر اظہار خیال کیا۔ علی جواد زیدی نے انیس صدی کے موقع پر میر انیس کے سلاموں کو یکجا کر کے اس پر ایک سیر حاصل مقدمہ لکھا۔ انھوں نے اس تفصیلی مقدمے میں سلام کی خصوصیات کو رثائی ادب کے سب سے بڑے شاعر میر انیس کے کلام کے خصوصی حوالے سے تفصیلی مثالیں دے کر پیش کیا ہے۔ اس ضمن میں اردو میں سلام کی تاریخ پر بھی نظر ڈالی ہے اور ان کا مقصد تحریر بھی بیان کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

> ''اردو کے قدیم ترین سلام جو شمالی ہند میں اب تک میری نظر سے گزرے ہیں، وہ محمد شاہ رنگیلے کے عہد سلطنت سے تعلق رکھتے ہیں۔ مقصد سرکار رسالت میں نذرانہ خلوص واحترام پیش کرنا ہے۔ یا پھر امام سے اظہار عقیدت اور سوگواروں سے اظہار تعزیت ہے۔'' ۲۷

علی جواد زیدی کا خیال ہے کہ سلام کو ادبی حیثیت سودا کے دور سے حاصل ہوئی ہے۔ سودا و میر کا زمانہ سلام کی تاریخ میں ایک اہم سنگ میل ہے۔ اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ سودا و میر کے زمانے میں سلام نے اردو شاعری میں ایک صنف سخن کی حیثیت سے شناخت حاصل کر لی۔ مذکورہ مضمون میں زیدی نے سلام نگاروں کو بھی دہلوی اور لکھنوی زمروں میں تقسیم کیا ہے اور لکھا ہے کہ اگر چہ اولیت کی حیثیت سے دہلی کے سلام نگاروں کو برتری حاصل ہے لیکن رفتہ رفتہ لکھنوی سلام نگاروں نے ان پر سبقت حاصل کر لی اور میر ضاحک، میر خلیق، میر ضمیر، مرزا دبیر، میر انیس اور میر مونس جیسے قادر الکلام شعرا نے لکھنوی دبستان کو فوقیت دلا دی۔ چوں کہ دوسرے مراکز کے مقابل مرثیہ کو لکھنؤ ہی میں عروج حاصل ہوا اسی طرح سلام کو بھی لکھنوی شعرا کے یہاں برتری حاصل ہوئی۔ زیدی نے اس مضمون میں سلام کے طرز خواندگی پر بھی سیر حاصل گفتگو کی ہے اور اس کے اقسام بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ سلام پڑھنے میں لے، دُھن، لحن اور موسیقی سے کوئی تعلق نہیں۔ بلکہ سلام خواندہ یا سلام پڑھنے والا، لفظ پر زور دینے، آواز

کے زیر و بم اور ہاتھ و آنکھوں کے اشاروں سے مطالب کی وضاحت اور طرز خواندگی میں حسن پیدا کرتا ہے۔انھوں نے لکھا ہے کہ اسے اصطلاح میں 'تحت اللفظ' کہتے ہیں۔ان کا خیال ہے کہ اس انداز خواندگی کو انیس نے بام عروج پر پہنچادیا۔اس مضمون میں زیدی نے نمونے کے طور پر کچھ سلام بھی پیش کیے ہیں جس سے انیس فہمی کے ساتھ ساتھ مضمون کی افادیت میں اضافہ ہوتا ہے۔سلام کے تعلق سے پاکستان کے مشہور ناقد انتظار حسین نے لکھا:

''سلام کو مرثیہ نگاروں کے یہاں ایک ضمنی حیثیت حاصل رہی ہے۔مرثیوں کے مرتبین نے بھی اس صنف کے ساتھ یہی سلوک کیا ہے۔کسی مرثیہ نگار کے مرثیوں کو مرتب کرتے ہوئے جتنے سلام میسر آئے وہ بیچ بیچ میں شامل کر دیے، باقیوں کے متعلق تر دد نہیں کیا۔میر انیس کے سلاموں کے ساتھ بھی یہی سلوک روا رکھا گیا۔انیس کے مرتبین کو ان کے جتنے سلام مل سکے وہ انھوں نے مرثیوں کے درمیان چھڑک دیے۔ باقیوں کو تلاش کرنے اور یکجا کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔'' ۲۸

درج بالا اقتباس راقم الحروف نے اپنی تصنیف ''علی جواد زیدی:شخص اور شاعر'' میں انتظار حسین کے مضمون ''سلام کا نشو ونما اردو میں'' مشمولہ ''باتیں ملاقاتیں'' (مجموعۂ مضامین) کے حوالے سے نقل کیا ہے۔اس پس منظر میں انیس کے سلاموں کے بارے میں علی جواد زیدی کا یہ مضمون نہایت اہمیت کا حامل ہے۔انیس کے سلاموں پر تحقیق کرتے ہوئے موصوف نے اس صنف کے نشو ونما اور اس کے ارتقائی سفر پر اچھی خاصی روشنی ڈالی ہے۔انھوں نے سلام کے تعلق سے یہ بتایا ہے کہ ''عربی میں تو یہ صنف سرے سے مفقود ہے۔فارسی میں اکا دکا سلام مل جاتا ہے مگر ان کی ادبی حیثیت اتنی وقیع نہیں۔اس صنف نے اصل میں اردو میں فروغ پایا ہے۔یہ الگ بات ہے کہ اردو شاعری کے ناقدین نے دوسری مذہبی اصناف کی طرح اس صنف کو بھی توجہ کے قابل نہیں سمجھا۔''

انیس کے سلام ۲۹ کے علاوہ انیس صدی کی مناسبت سے علی جواد زیدی نے ''رباعیات انیس'' ۳۰ کو مرتب کرنے کا کارنامہ انجام دیا جس پر زیدی نے ایک مفصل مقدمہ تحریر کیا ہے جس میں رباعی کا مکمل تعارف، تاریخ اور اردو کے علاوہ دیگر زبانوں میں رباعی کی صنف اور اس کے ارتقائی سفر پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے انھوں نے رباعی کی اصل فارسی کو قرار دیا ہے۔انھوں نے رباعی کی تاریخ کے ساتھ ہی اس کے اوزان پر بھی بحث کی ہے۔اس بحث میں اساتذۂ فن کی آرا، ان کے مباحث و تحقیق کے ساتھ ہی دیگر حیثیت سے بھی رباعی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔اس مقدمہ کی تحقیقی و تنقیدی حیثیت اور اس کے اعلیٰ وارفع ہونے کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس میں اساتذۂ فن کی فرو گذاشتوں کی نشاندہی کرتے ہوئے ان تسامحات کو بھی گرفت میں لایا گیا ہے۔

زیدی اس مقدمہ میں فارسی رباعی کا بھی جائزہ لیتے ہیں اور خیام کو فارسی زبان وادب کا سب سے زیادہ شہرت کا حامل رباعی گو شاعر تسلیم کرتے ہیں۔فارسی کے ساتھ ساتھ اردو رباعی گو شعرا کا کماحقہ محاکمہ کرتے ہوئے زیدی نے قلی قطب شاہ اور ملا وجہی کی رباعیوں کا خاص طور سے ذکر کیا ہے۔مذکورہ شعرا کے علاوہ حاتم، درد، مصحفی، میر تقی میر، عزت اللہ عشق، میر سوز، قدرت اللہ قاسم، جعفر علی حسرت، ولی دکنی، مومن دہلوی، میر حسن دہلوی جیسے اہم شعرا کی رباعی پر گفتگو کی ہے۔زیدی نے یہاں پر اس حقیقت سے پردہ اٹھایا ہے کہ فاسی کے تتبع کے باوجود اردو والوں نے رباعی سے دلچسپی نہیں دکھائی اس کی وجہ انھوں نے اردو شعراء کی غزل میں دلچسپی قرار دیا ہے۔انھوں نے اس بات کا ذکر کیا ہے کہ اردو میں رباعیاں

کہی گئیں تو مرثیہ گوشعرا کے ذریعہ جس کی عمدہ مثال انیس ودبیر کے یہاں ملتی ہے۔علی جوادزیدی نے لکھا ہے کہ مرثیہ گوشعراء مرثیہ کی خوانندگی سے قبل ایک دو رباعی ضرور پڑھا کرتے تھے اس وجہ سے مرثیہ گوشعراء کے یہاں اس کا چلن اور رواج ہوگیا اس پر مزید بحث کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے کہ خلیق اچھے غزل گو تھے۔استادفن تھے،مرثیہ گو تھے اور موجودہ شواہد کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ ان کے دور میں مرثیوں سے پہلے رباعی اور سلام پڑھنے کا رواج عام ہوگیا تھا۔ان کے ہم عصروں میں میرضمیر اور مرزا فصیح کے یہاں بھی رباعیاں موجود ہیں۔اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ دیگر اصناف سخن کے مقابلے مرثیہ گوشعراء میں رباعی کہنے اور پڑھنے کا چلن بہت زیادہ رہا۔مذکورہ مقدمہ تحقیقی اور تنقیدی اعتبار سے اعلیٰ مضامین کا حامل ہے۔علی جوادزیدی نے اس مقدمہ میں رباعی کے اوزان پر تفصیلی بحث کی ہے۔ان کے مطابق رباعی میں مضمون درجہ بہ درجہ ارتقا کی منزلیں طے کرتا ہے اور آخری مصرع انتہائی اہمیت کا حامل ہوتا ہے اس لیے کہ اس میں ابتدائی مصرعوں کا نچوڑ چوتھے مصرعے میں بے ساختی کے ساتھ اس طرح ادا کرنا ہوتا ہے کہ انسان بے ساختہ واہ کہنے پر مجبور ہو جائے۔یہ بات ہر شاعر کے مقدر میں نہیں آتی۔یہ صنف نہایت مشق وریاض کے بعد ہی اپنے تقاضوں کو پورا کرتی ہے اور کثرت مشق وریاض کے بعد ہی رباعی گو شاعر کامیابی حاصل کرتا ہے۔مذکورہ مقدمہ میں علی جوادزیدی نے انیس کے پیش رو اور ان کے معاصرین کی رباعیوں کا تقابلی مطالعہ پیش کرتے ہوئے انیس کو اردو رباعی کا سب سے بڑا شاعر قرار دیا ہے۔انیس کی رباعیاں موضوعات کے اعتبار سے مختلف النوع حیثیت رکھتی ہیں لیکن زیادہ تر رباعیاں رباعی کی ایک ضمنی صنف رثائی رباعیوں کو ہی محیط ہیں اور انھیں رباعیوں کو انیس نے اپنا خاص موضوع بنایا ہے۔اس لیے کہ یہ رباعیاں انیس نے مجلسوں کی خواندگی کے لیے لکھی تھیں جو مرثیے سے پہلے سامعین کے سامنے پیش کرتے تھے۔علی جوادزیدی نے ''اعتقادیات'' کی سرخی کے تحت اس نکتے کی طرف اشارہ کیا ہے:

> ''انیس کی رباعیاں مشاعروں اور نجی یا درباری محفلوں میں پڑھنے کے لیے نہیں بلکہ ایسے عقیدت مندوں کی چھلکتی ہوئی مجلسوں میں پڑھنے کے لیے لکھی گئی ہیں جن کو بنیادی طور پر دین سے شغف بھی ہے اور جو روایت پسند بھی ہے۔ان میں نظر اٹھتے ہوئے قدموں سے زیادہ صراط مستقیم پر رہتی ہے۔''۳۰

''اعتقادیات'' کے علاوہ علی جوادزیدی نے مذکورہ مقدمہ میں ''لہجہ وآہنگ،فلسفۂ حیات،نعت ومنقبت'' اور ''رثائی رباعیاں'' کے ذیلی عنوانات کے تحت تنقیدی بحث کی ہے۔انھوں نے سید محمد عباس کے ''رباعیات انیس'' کے مقدمے کو سامنے رکھ کر لکھا ہے کہ موصوف نے انیس کی رباعیوں کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے(۱)مذہبیات(۲)اخلاقیات(۳)ذاتیات۔لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ ان کی کل رباعیاں مذہبیات کے تحت میں آتی ہیں۔علی جوادزیدی سید محمد عباس کے ہم نوا نظر آتے ہیں وہ لکھتے ہیں:

> ''واقعہ یہ ہے کہ انیس کے کلام میں اعلیٰ مذہبی اقدار کی پرچھائیں ہر جگہ نظر آتی ہے،حد یہ ہے کہ ذاتیات پر بھی اسی کی جھلک پڑتی ہے اور خود یہ تصور مذہبی اخلاق عالیہ کا ہم رکاب ہے۔''۳۱

علی جوادزیدی کا خیال ہے کہ رثائی رباعیوں کی فنی عظمت دلانے کا سہرا انیس کے سر ہے۔اس حوالے سے انھوں نے لکھا:

> ''رباعیوں کی ایک ضمنی صنف ''رثائی رباعیوں'' کی مستقل حیثیت میرانیس ہی نے منوائی۔ان کے پہلے بھی رثائی رباعیاں مل جاتی ہیں۔ہدایت،میر،مومن اور خود خاندان انیس میں میرحسن کے یہاں رثائی رباعیاں پائی جاتی ہیں لیکن استثنائی حیثیت رکھتی ہیں۔انیس نے رباعی کی اس شاخ 'رثائی' کو کمیت اور کیفیت دونوں ہی

اعتبار سے باوثوق،معتبر اور ثقہ بنایا۔اس معاملے میں دبیر اور دوسرے مرثیہ گو بھی انیس کے قدم بہ قدم چلتے نظر آتے ہیں۔‘‘۳۲

علی جواد زیدی نے ’’اخلاقی رباعیاں‘‘ کے عنوان سے بحث کرتے ہوئے سید امداد امام اثر۳۳ کے اس مشہور قول کو سامنے رکھا ہے جس میں امداد امام اثر نے انیس و دبیر کی رباعیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ’’ان دونوں نے اردو میں رباعی نگاری کی شرم رکھ لی۔‘‘ امداد امام اثر کی اس رائے پر تبصرہ کرتے ہوئے زیدی نے لکھا ہے کہ ’’اگر چہ اثر نے انیس اور دبیر دونوں ہم عصروں کا نام ایک ساتھ لیا ہے لیکن انیس کا مرتبہ یقیناً بلند تر ہے۔‘‘ زیدی نے مزید لکھا:

’’انھوں نے اخلاقی رباعیوں کا جو ذخیرہ چھوڑا ہے وہ بہت وسیع اور متنوع اور ادبی اعتبار سے استوار ہے۔‘‘۳۴

مذکورہ مقدمہ میں آخر میں زیدی نے رباعیوں کی تدوین پر تفصیلی بحث کرتے ہوئے اس سے قبل کی مرتبہ رباعیوں کے مجموعوں سے استفادہ کرتے ہوئے ان کے تدوینی طریقۂ کار پر بھی بحث کی ہے۔اس ضمن میں انھوں نے :

(۱)’’رباعیات انیس‘‘ (مرتبہ سید محمد حسن بلگرامی،مطبوعہ ۱۹۰۹ء)

(۲) انیس اخلاق (دارالتصنیف، امیریہ محمود آباد مطبوعہ ۱۹۳۹ء)

(۳) رباعیات انیس (مرتبہ عالم حسین، نظامی پریس لکھنؤ سنہ ندارد)

(۴) رباعیات انیس (مرتبہ عمر فیضی، لاہور ۱۹۵۶ء)

(۵) رباعیات انیس (مرتبہ سید محمد عباس،نول کشور پریس لکھنؤ ۱۹۴۷ء)

کے علاوہ ضمیر اختر نقوی کے کلید گنجینہ انیس (اشاریہ مراثی، سلام اور رباعیات انیس) سے استفادہ کیا ہے۔اس مقدمے سے زیدی کی محنت شاقہ کا اندازہ ہوتا ہے۔ادھر حال میں رثائی ادب کے مشہور پارکھی ڈاکٹر تقی عابدی (کنیڈا) نے انیس اور دبیر کی رباعیوں کو سائنٹفک طریقہ سے مرتب کیا ہے اور اس پر عالمانہ مقدمہ بھی تحریر کیا ہے، جس میں موصوف نے زیدی کے اس مقدمہ پر تنقیدی نظر ڈالتے ہوئے انھیں خراج تحسین پیش کیا ہے۔

علی جواد زیدی کو رثائی ادب خصوصاً مرثیہ سے خصوصی دلچسپی رہی ہے اور اس صنف کے حوالے سے انھوں نے متعدد مضامین سپرد قلم کیے ہیں، رثائی ادب سے دلچسپی کے سبب انھوں نے قیام بمبئی کے دوران دوماہی ’’العلم‘‘ نامی رسالہ بھی مشہور صنعت کار ڈاکٹر سید اختر حسن (رضوی بلڈرس) کے تعاون سے جاری کیا، جس کے مرثیہ نمبر، مرثیہ و سلام نمبر، شہادت نمبر اور نعت خیر المرسلین نمبر نے اعتقادی خصوصاً رثائی ادب کے منتشر مواد کو قارئین کے سامنے پیش کیا خصوصاً انھوں نے نعت خیر المرسلین نمبر کی پیشکش میں جہاں نعت کے متعدد اصناف اور ہیئت کے نمونے پیش کیے وہیں اردو مرثیوں میں نعتیہ عناصر کی پیشکش سے اہل ادب کی توجہ اس گوشے کی طرف بھی دلائی۔زیدی اردو نقادوں سے اس بات کے شاکی ہیں کہ اعتقادی ادب یعنی نعت و منقبت، مولودنامے، شہادت نامے اور سلام کے ساتھ ساتھ مرثیے کے ساتھ بھی بے اعتنائی برتی گئی لیکن وہ شبلی نعمانی جیسے صاحب نظر کے شکر گزار ہیں، جنھوں نے موازنۂ انیس و دبیر لکھ کر مرثیہ کے فنی اقدار اور اس کی مختلف جہتوں پر بحث کو آگے بڑھایا اور مرثیے کو مذہبی دائرے

سے نکال کرفن کی کسوٹی پر پرکھنے کا راستہ دکھایا۔

علی جواد زیدی مرثیہ کی بنیاد محبت اور انسانی اقدار کو قرار دیتے ہیں ان کا خیال ہے کہ محبت ایک عالم گیر جذبہ ہے،اسی لیے رثائی ادب دنیا کے سبھی ملکوں اور زبانوں میں کسی نہ کسی شکل میں روایت کی شکل میں موجود ہے۔اردو مرثیہ نگاروں کی رسائی عام طور سے عربی، فارسی اور بعض صورتوں میں ترکی مرثیوں تک تھی۔مرثیہ پر عام طور سے یہ اعتراض بھی کیا جاتا ہے کہ دکن اور اودھ کی شیعہ ریاستوں کی سرپرستی کے سبب اس کو عروج حاصل ہوا۔اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ دکن اور اودھ کے حکمرانوں کے شیعی عقائد کے سبب اس صنف کی سرپرستی کی گئی لیکن علی جواد زیدی نے مختلف منابع اور اردو شعرا کی بڑی تعداد کی دہلی میں موجودگی اور وہاں پر مرثیہ گوئی کی مضبوط اور توانا روایت کو پیش کر کے اس الزام سے اردو مرثیہ کو بچالیا کہ یہ صنف دکن اور اودھ کے فرمانراؤں کی مرہون منت ہے۔''دہلوی مرثیہ گو'' نامی کتاب زیدی نے دوجلدوں میں شائع کی ہے اور زیدی کی محنت شاقہ کو دیکھتے ہوئے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ کتاب کے مواد کی فراہمی میں انھوں نے کتنی مشقت اٹھائی ہے۔یوں تو زیدی نے مرثیے کے حوالے سے میر انیس، جدید مرثیے کے بانی ضمیر لکھنوی جیسی اہم کتابیں تصنیف کی ہیں لیکن دہلوی مرثیہ گو ان کا بڑا کارنامہ ہے جو انھیں مرثیہ کی تنقید و تحقیق میں اولین صف میں کھڑا کرتی ہے،جس کا اعتراف مرثیہ کے معتبر محقق و ناقد پروفیسر نیر مسعود نے بھی کیا ہے:

> ''دہلوی مرثیہ گو اور جدید مرثیہ کے بانی میر ضمیر لکھنوی، انیس کے سلام، رباعیات انیس اور بہت سے مضامین رثائی ادب میں ان کے تحقیقی کارنامے ہیں۔ان میں کوئی بھی کام زیدی صاحب نے سرسری نہیں کیا بلکہ موضوع کے اطراف کا احاطہ کر کے بہت سی غیر مطبوعہ یا غیر مدونہ چیزوں کو سامنے لائے ہیں۔''۳۵

''دہلوی مرثیہ گو'' زیدی کا مرثیہ کے حوالے سے بڑا کام ہے جس کی اہل ادب نے پذیرائی کی۔پاکستان سے علامہ ضمیر اختر نقوی کے علاوہ ماہنامہ معارف اعظم گڑھ میں صباح الدین عبدالرحمٰن نے زیدی کی اس کاوش کو سراہا۔لکھنؤ کے مشہور شاعر شرف رضوی نے زیدی کے انتقال کے بعد جو نظم بطور خراج تحسین پیش کی اس میں 'دہلوی مرثیہ گو' کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے۔

منفرد ناقد، محقق، عہد حاضر کا نقیب — دوسرا ممکن نہیں ہے اس کے جیسا اب ادیب
مرثیہ گویان دہلی کی عجب تصدیق کی — کتنی راہیں کھول دیں اک شخص نے تحقیق کی۳۶

دہلوی مرثیہ گو (جلد اول) کے مبسوط مقدمہ کو سید فدا حسین حسینی نے اپنی مرتبہ کتاب ''اصناف سخن زیدی کی نظر میں'' مرثیہ کے عنوان سے شائع کیا ہے۔

زیدی صاحب کی یہ کتاب دو جلدوں پر مشتمل ہے۔پہلی جلد ۱۹۸۶ء کی مطبوعہ ہے۔جبکہ دوسری جلد مصنف نے ۱۹۸۷ء میں شائع کی ہے۔پہلی جلد نفیس اکیڈمی کراچی سے ۱۹۸۸ء میں بھی طبع ہوئی ہے،جس کا تعارف اس طرح ہے۔اس میں ۴۵صفحات پر مشتمل ایک طویل مقدمہ ہے، جو اس کتاب کا مغز ہے۔مقدمہ میں کتاب پر تفصیل کے ساتھ لکھا گیا ہے۔اس کے ساتھ ہی فن مرثیہ اور مرثیہ گو شعراء پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔مقدمے میں دلی کی عزاداری،مرثیہ خوانی اور مرثیہ گوئی، قدیم بیاضیں، دہلوی کون؟ کے ساتھ ساتھ ادوار کے ذیلی عنوانات کے تحت بڑی اہم معلومات پیش کی گئی ہے،جس سے کتاب کی اہمیت کا بھی اندازہ ہوتا ہے اور مرثیہ کی تاریخ پر بھی اچھی معلومات حاصل ہوتی ہے۔

کتاب کی ابتدا ''چند ابتدائی نقوش'' عنوان سے ہوئی ہے۔جس میں اکبر بادشاہ کے عہد کے ایک اردو گو شاعر ملا نوری کی مرثیہ گوئی کا ذکر کیا

ہے۔حیرت کی بات یہ ہے کہ زیدی صاحب نے شہنشاہ اکبر کے عہد کے ایک مرثیہ گو کو بھی اپنی تحقیق کے ذریعہ تلاش کرلیا اوران کی مرثیہ گوئی کا حوالہ بھی دے دیا ہے۔یہ موصوف کے اس میدان میں اعلیٰ محقق ہونے کی دلیل ہے۔اس کے بعد شیخ اشرفؔ اشرف کا ذکر کیا ہے۔اس حصے میں جن دہلوی مرثیہ گویان کا ذکر کیا گیا ہے۔ان میں کچھ اہم نام اس طرح ہیں:فضل علی فضلی،غمگین،حزیں، رضا، میر محمد قائم،نظر بیگ خادم،آبرو،محمد شاکرناجی،شاہ ظہورالدین حاتم،غلام مصطفیٰ خاں یکرنگ،حاتم بیگ وافی،حسن،میر محمد علی محبؔ،مرزا احمد خاں اور میر محمود صابر جیسے مرثیہ گوشعراء کا ذکر کیا گیا ہے۔

اس فہرست پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس تلاش وتحقیق میں زیدی صاحب نے کس درجہ محنت اور جانفشانی سے کام لیا ہے۔حتیٰ کہ یہاں پر انھوں نے کچھ ایسے شعراء کا ذکر بھی کیا ہے،جن کو دہلوی مرثیہ گو کی حیثیت سے آپ نے ہی شناخت عطا کی ہے۔ان میں سے کچھ ایسے بھی ہوسکتے ہیں،جن کو پہلے کبھی مرثیہ گوشاعر کی حیثیت سے جانا ہی نہیں گیا۔اس کا ثبوت خود زیدی صاحب کی تحریر سے ملتا ہے جیسا کہ وہ خود رقم طراز ہیں:

> ’’جو مواد اب تک فراہم ہو چکا ہے اس کی بنیاد پر یہ بتانا ممکن نہیں ہے کہ دلی کا پہلا مرثیہ نگار کون تھا۔قدیم ادب کی سبھی صنفوں کے بارے میں اولیت کا سوال مدتوں محتاج جواب ہی رہتا ہے۔ مرثیوں کے سلسلے میں یہ مشکل اس لیے بھی اور بڑھ جاتی ہے کہ یہ صنف مدتوں تذکرہ نگاروں اور تاریخ نویسوں کی توجہ سے محروم رہی اور ابھی تک بنیادی تاریخی مواد کی باقاعدہ تدوین شروع بھی نہیں ہوئی۔‘‘۳۷

یہاں پر زیدی نے دہلوی مرثیہ نگاروں کے عدم تعارف کو اس کی وجہ بھی بیان کرتے ہوئے رقم کیا ہے کہ تذکرہ نگاروں کی عدم توجہی کی وجہ سے یہ صورت حال رہی ہے۔کتاب کے اس حصے میں آپ نے مذکورہ بالا شعراء کا ذکر کرنے کے بعد اس کے دوسرے حصے کو’’ادبی دور‘‘ کے عنوان سے شروع کیا ہے۔کتاب کے اس حصے میں جن شعراء کا ذکر کیا گیا ہے،ان میں اکثر معروف شعراء حضرات ہیں اوران میں کچھ تو اردو ادب بالخصوص رثائی ادب کے اہم ستون ہیں،جن میں مرزا محمد رفیع سودا، شاہ عالم آفتاب، اشرف علی خاں فغان،خواجہ محمد اکرم اکرم، میر امانی، میر غلام حسین ضاحک،نظر علی گمان، میر تقی میر، قیام الدین قائم،سید محمد میر سوز، میر محمد علی نیاز، میر غلام حسن حسنؔ،سید عطاء اللہ عطا، ولی محمد ولی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ان میں بھی میں نے اہم ناموں کا ہی ذکر کیا ہے۔طوالت کے خوف سے غیر اہم ناموں کو نظرانداز کردیا گیا ہے۔

یہ کتاب چوں کہ ایک تذکرہ ہے اور تذکروں میں عموماً صاحب ذکر حضرات کے کوائف وکیفیات وغیرہ ہی نقل کیے جاتے ہیں ان سے متعلق فن پر کم ہی لکھا جاتا ہے۔اسی وجہ سے زیدی صاحب نے اس کتاب میں ایک مبسوط مقدمہ تحریر کردیا ہے،جس میں مرثیے کے فن کے تعلق سے بڑی اہم ومفید معلومات یکجا کردی ہیں جو مرثیہ تنقید میں اہمیت کا حامل بن گیا ہے،جس کی اہمیت ثابت کرنے کے لیے سطور ذیل میں اس مقدمے سے ایک اقتباس نقل کیا جارہا ہے،جس سے دہلوی مرثیے کی عظمت وافادیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

> ’’دہلوی مرثیہ صرف اس لیے ہی اہم نہیں ہے کہ لکھنوی مرثیے کا راہبر وپیش رو ہے بلکہ اس لیے بھی اہم ہے کہ یہ اردو مرثیہ گوئی کی تاریخ کی سب سے ضروری کڑی ہے جو مواد اب تک ہمارے سامنے آچکا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ دہلی کی اردو مرثیہ گوئی اورنگ زیب کے آخری زمانے

سے شروع ہوکر فرخ سیر اور محمد شاہ کے زمانے میں اپنے انتہائی عروج کو پہنچ چکی تھی۔''۳۸

ہمارے ناقدین نے عموماً سلام، مرثیوں، نوحوں اور اس طرح کے مواد کو ادبی ولسانی حیثیت سے کم درجہ دیا ہے مگر زیدی صاحب اس سے شدید اختلاف رکھتے ہیں۔ وہ کتاب کے مقدمے میں اس کی لسانی حیثیت کو اس طرح واضح و ثابت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں:

''لسانی اعتبار سے (رثائی ادب کی) اہمیت یہ ہے کہ زبان اردو میں جو عہد بعہد تبدیلیاں ہوئی ہیں، ان کا اظہار سب سے زیادہ ہمارے رثائی ادب میں ہوتا ہے۔ خاص کر عوام کی بول چال کی زبان اور شرفاء کی زبان کی تدوین و تحقیق کے لیے ان مراثی میں گراں قدر سرمایہ محفوظ ہے۔''۳۹

مذکورہ کتاب کی دوسری جلد ۱۹۸۷ء میں شہناز پبلی کیشنز، لکھنؤ سے شائع ہوئی ہے۔ حسب سابق اس جلد میں بھی مقدمہ دیا گیا ہے مگر یہ نہایت مختصر ہے۔ پھر کتاب کو ارتقائی دور، دور جدید، عصر حاضر کے عنوانات کے تحت تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے، جس کے بعد ایک ضمیمہ بھی ہے۔ آخر میں کتابیات پر اس کا اختتام ہوتا ہے۔ اب اس کے مندرجات پر نظر ڈالی جارہی ہے تا کہ ان کو قارئین کے سامنے لایا جا سکے۔

کتاب کو بآسانی سمجھنے کے لیے ہم اس کتاب کے مقدمے سے ایک اقتباس نقل کرتے ہیں، جس میں اس کے مندرجات کا ذکر بھی ہے اور رثائی ادب کی ایک اہم صنف ''سلام'' کی بھی وضاحت کی گئی ہے۔

''زیرنظر جلد میں ارتقائی دور سے لے کر عصر حاضر تک کے مرثیہ گویوں کے بارے میں معلومات پیش کی گئی ہیں۔ حتی الوسع نمونہ ہائے کلام بھی دیے گئے ہیں۔ یہاں یہ ظاہر کرنا بھی ضروری ہے کہ دلی میں سلام گوئی کا رواج زیادہ ہے اور یہی مغل بادشاہوں کا طریقہ بھی تھا۔ یہ سلام شروع میں مرثیہ کہلاتے تھے اور اب بھی رثائی ادب کا حصہ ہیں۔ اور اب سلاموں کو مستقل صنف کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے''۴۰

اس جلد میں مواد کچھ زیادہ ہی ہے اور بڑی تفصیل کے ساتھ شعراء حضرات کے کوائف اور معلومات تحریر کی گئی ہے۔ پہلے حصے ''ارتقائی دور'' میں اہم شعراء حضرات میں مرزا جعفر علی حسرت، شاہ محمد عظیم، مرزا ظہور علی خلیق، مرتضٰی خاں نثار، غلام ہمدانی مصحفی، میر قدرت اللہ قاسم، مرزا محمد اسمٰعیل طپش، سعادت یار خاں رنگین، غلام اشرف، حکیم ثناءاللہ فراق، میر شیر علی افسوس، مرزا سلیمان شکوہ سلیمان، مرزا آغا ذہین، انور دہلوی، میر باقر علی باقر، احمد قزلباش، حیدر بخش حیدری، مولانا محمد باقر اور مرزا غلام حیدر مجذوب وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ اس زمرے میں کل ۳۷ شعراء کے کوائف دیے گئے ہیں۔ راقم الحروف نے بخوف طوالت یہاں پر چند خاص کا ہی ذکر کیا ہے۔ اس کے بعد کتاب کا دوسرا حصہ ''ب- دور جدید'' شروع ہوتا ہے۔ یہاں پر بھی ۳۲ شعراء کا ذکر کیا گیا ہے، جن میں چند نمایاں حضرات کے اسماء گرامی اس طرح ہیں: شیخ محمد ابراہیم ذوق، مرزا غالب، محمد ظہور علی، میر سید علی شائق، مرزا قادر شکوہ، مہر علی دہلوی، محمد حسین آزاد، سید علی متین، سید محمد علی قدیر، معین الدین حیدر سجاد، مرزا قربان علی بیگ سالک، حیدر علی بیگ حیدر، مرزا داغ دہلوی، سید ظہیر الدین ظہیر، مرزا محمد تقی بیگ مائل، سید حیدر عباس حیدر، بشیر الدین احمد بشیر وغیرہ کا نام سرفہرست آتا ہے۔ اس کے بعد کتاب کا تیسرا حصہ ''ج-عصر حاضر'' کے عنوان سے شروع ہوتا ہے، جن میں زیدی نے اپنے زمانے کے دہلوی مرثیہ گو شعراء کا ذکر کیا ہے۔ اس حصے میں کل ۱۵ حضرات کا تذکرہ ہے، جن کے نام اس طرح ہیں: آغا شاعر قزلباش، حکیم اشتیاق حسین شوق، بشیشر پرشاد منور، گوپی ناتھ امن، شمیم کرہانی، مخمور دہلوی، کرار نوری، ڈاکٹر یاور عباس یاور، مظفر حسین شاداں، افسر زیدی، درشن سنگھ، جاوید وششٹ، رام نرائن جگر، پریم چند گپتا، اس کے بعد ضمیمہ دیا گیا ہے، جس میں باقی ماندہ مواد کو سمو دیا گیا ہے۔ اس طرح تقریباً تین سو (۳۰۰) صفحات میں یہ کتاب مکمل ہو جاتی ہے جسے دہلی کے مرثیہ گو شعراء کا محض

ایک تذکرہ ہی نہیں بلکہ تنقیدی وتحقیقی دستاویز قرار دی جاسکتی ہے۔زیدی صاحب کا یہ ایک ایسا عظیم اور نادرروزگار کارنامہ ہے جس کی وجہ سے آپ کو اردوادب میں ایک نمایاں وممتاز مقام حاصل ہوتا ہے۔

علی جواد زیدی نے دہلوی مرثیہ گویوں کا جائزہ لیتے ہوئے مرثیہ کی تاریخ پر بھی نظر ڈالی ہے۔انھوں نے لکھا ہے کہ ہندوستان میں اس کا رواج عراق،حجاز،مصر،ایران،افغانستان اور ترکی سے آیا۔مرثیہ کا تعلق خصوصی طور پر ذکر حضرت امام حسین سے ہے۔اس لیے اس کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ ہندوستان میں اس کے عروج کی وجہ یہ بھی رہی ہے کہ یہاں پر مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد علاقائی حکمراں ونوابین کی اکثریت امام حسین علیہ السلام سے عقیدت رکھتی تھی۔ساتھ ہی یہاں کے صوفیائے کرام کے آستانے عزائے امام حسین کے فروغ میں پیش پیش تھے،اس لیے اس صنفِ سخن کو بہت فروغ ملا۔ابتدائی طور پر اگر چہ یہ مرثیے مقامی بولیوں میں بھی لکھے جاتے تھے لیکن لوک ادب کے دوسرے اصناف کی طرح بیشتر ضائع ہوگئے۔ ہماری ادبی تاریخ میں اس کے شواہد ملتے ہیں کہ مراٹھی،سندھی،ملتانی،پنجابی،پوربی اور کشمیری وغیرہ بولیوں میں بھی مرثیے لکھے جاتے تھے۔کشمیری میں قدیم مراثی کا ایک بہت بڑا ذخیرہ دستیاب ہوا ہے اور اس کا ایک حصہ شائع بھی ہو چکا ہے۔علی جواد زیدی کے مطابق قدیم اردو مراثی کی جو بیاضیں حیدرآباد،علی گڑھ،رام پور،پٹنہ،مرشدآباد اور ممالک غیر میں ملتی ہیں ان میں ہندی،فارسی زبانوں میں مراثی موجود ہیں۔ مرثیوں کے ادبی ارتقائی تاریخ میں قدیم مرثیوں کی بڑی اہمیت ہے۔یہ قدیم مرثیے طول عرض ملک میں بکھرے پڑے ہیں،جو ہمارا بڑا اہم رثائی سرمایہ ہے۔

مذکورہ مقدمہ میں''دلی کی عزاداری'' کے عنوان سے بھی ایک باب ہے،جس میں دلی میں ہونے والی عزاداری پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔اس عزاداری میں مرثیہ خوانی کا بھی اہتمام ہوتا تھا،جس کی وجہ سے مرثیوں کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔امام حسین کی ذات سے اسلام کے سبھی فرقوں کو عقیدت تھی او ریہ مجلسیں شیعہ اور سنی دونوں ہی منعقد کیا کرتے تھے۔اس مضمون میں زیدی صاحب نے یہاں کی عزاداری پر تفصیلی نظر ڈالی ہے۔

اس مضمون کا ایک اور باب''مرثیہ خوانی اور مرثیہ گوئی'' کے عنوان سے بھی ہے،ان کے علاوہ،قدیم بیاضیں،دہلوی کون؟ اور ادوار کے عنوانات سے بھی ذیلی سرخیاں ہیں،جن میں مرثیوں کے حوالے سے بہت کچھ لکھا گیا ہے اور زیدی کی یہ تحریریں رثائی تنقید وتحقیق کا ایک اہم حصہ بن جاتی ہیں۔اس طرح زیدی کے رثائی متون یہ ثابت کرتے ہیں کہ رثائی تنقید وتحقیق میں زیدی کے اکتسابات کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

حواشی:

(۱) علی جواد زیدی: پیش لفظ''میرانیس''،ساہتیہ اکادمی،نئی دہلی ۱۹۹۱ء،ص:۷

(۲) علی جواد زیدی:''میرانیس''،ساہتیہ اکادمی،نئی دہلی ۱۹۹۱ء،ص:۸۴

(۳) ایضاً،ص:۸۵

(۴) حالی،مقدمہ شعروشاعری،مرتبہ وحید قریشی،مکتبہ جدید لاہور،۱۹۵۳ء،ص:۲۶۶-۲۶۲

(۵) علی جواد زیدی،میرانیس،ص:۸۷

(۶) ایضاً،ص:۸۷

(۷) ایضاً،ص:۸۷

(۸) ایضاً،ص:۸۸

(۹) ایضاً،ص:۸۹

(۱۰) ایضاً،ص:۹۱ (۱۱) ایضاً،ص:۹۳

(۱۲) ایضاً،ص:۱۲۰

(۱۳) علی جواد زیدی، جدید مرثیے کے بانی ضمیر لکھنوی، یونائیٹیڈ پریس لکھنؤ ۱۹۹۸ء،ص:۱۱

(۱۴) ایضاً،ص:۵۰ (۱۵) ایضاً،ص:۵۰

(۱۶) ایضاً،ص:۵۰-۵۱ (۱۷) ایضاً،ص:۵۱

(۱۸) ایضاً،ص:۵۳ (۱۹) ایضاً،ص:۵۴

(۲۰) ایضاً،ص:۵۵ (۲۱) ایضاً،ص:۵۸

(۲۲) پیغمبران سخن، شاد عظیم آبادی،ص:۲۶-۲۵

(۲۳) خم خانۂ جاوید (جلد ۵)، لالہ سری رام،ص:۳۷۶

(۲۴) لکھنؤ کا دبستان شاعری، ابواللیث صدیقی،ص:۸۰-۶۷۹

(۲۵) علی جواد زیدی، جدید مرثیے کے بانی ضمیر لکھنوی،ص:۱۷

(۲۶) علی جواد زیدی، اصناف سخن زیدی کی نظر میں: مرتبہ سید فدا حسین حسینی لکھنؤ،ص:۶۲

(۲۷) ایضاً،ص:۴۷-۴۶

(۲۸) عابد حسین حیدری، علی جواد زیدی: شخص اور شاعر، ایم آر پبلی کیشنز، نئی دہلی ۲۰۰۹ء،ص:۱۱۷-۱۱۶

(۲۹) علی جواد زیدی (مقدمہ) رباعیات انیس، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی، ۲۰۱۳ء

(۳۰) ایضاً،ص:ixix (۳۱) ایضاً،ص:ixxii

(۳۲) ایضاً،ص:ixxvii

(۳۳) امداد امام اثر، کاشف الحقائق

(۳۴) علی جواد زیدی (مقدمہ) رباعیات انیس،ص:ixxx

(۳۵) نیر مسعود، زیدی صاحب کی یاد، نیا دور لکھنؤ، نومبر، دسمبر ۲۰۰۵ء،ص:۱۶

(۳۶) شرف رضوی، نذر علی جواد زیدی، نیا دور لکھنؤ، نومبر دسمبر ۲۰۰۵ء،ص:۳۷

(۳۷) علی جواد زیدی، دہلوی مرثیہ گو، نفیس اکیڈمی کراچی، ۱۹۸۸ء،ص:۵۴

(۳۸) ایضاً،ص:۳۱ (۳۹) ایضاً،ص:۵۱

(۴۰) علی جواد زیدی، دہلوی مرثیہ گو شعراء، جلد دوم،ص:۶

☆☆☆☆☆

کہاوت وحکایت اورڈاکٹرشریف احمدقریشی۔۔۔۔۔ایک مطالعہ

ڈاکٹرای اے حیدری
اسوسی ایٹ پروفیسر،شعبۂ اردو
گورنمنٹ لوہیاپی جی کالج چورو،راجستھان

شریف احمدقریشی نام،عبدالغفورقریشی ولدیت،۱۵/جولائی ۱۹۵۳ء تاریخ پیدائش اوراتر پردیش کے مشہورصنعتی شہرکان پورکی تحصیل گھاٹم پور وطن مالوف ہے،قاضی سعیدالدین چشتی قادری کے ہاتھوں تین یاچار برس کی عمرمیں ان کی رسم بسم اللہ انجام پائی۔جس کا سلسلہ گزشتہ برس تک جاری تھا اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ۱۹۶۸ء میں ہائی اسکول، ۱۹۷۱ء میں ادیب کامل، ۱۹۷۴ء میں انٹرمیڈیٹ، ۱۹۷۶ء میں بی اے، ۱۹۷۷ء میں آئی جی ڈی (بمبئی)، ۱۹۷۸ء میں ایم اے(اردو)، ۱۹۸۰ء میں ایم اے(ہندی)، ۱۹۸۱ء میں بی ایڈ، ۱۹۸۲ء میں کامل، ۱۹۸۴ء میں عالم، ۱۹۸۶ء میں ایم فل کے امتحانات نمایاں نمبروں سے پاس کئے ۱۹۹۱ء میں فرہنگ فسانۂ آزاداوراس کا عمرانی لسانی مطالعہ کے موضوع پر جواہرلعل نہرو یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی اوراگست ۲۰۱۰ء میں اردوکہاوتوں کی جامع فرہنگ کے موضوع پرایم جے پی روہیل کھنڈ یونیورسٹی بریلی میں ڈی لٹ کی ڈگری کے لئے مقالہ داخل کیا۔

رضاپی جی کالج رام پور کے شعبۂ اردو میں اسوسی ایٹ پروفیسر کے عہدے سے سبکدوش ہوکراب بھی درس وتدریس اورزبان وادب کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔مزاج میں عاجزی وانکساری کے ساتھ ساتھ سادگی وخلوص کا پہلوصاف جھلکتا ہے۔شعروشاعری سے فطری لگاؤ ہے علامہ حق بنارسی سے شرف تلمذحاصل ہے۔

اردوو ہندی نثر میں ایک درجن کے قریب کتابیں شائع ہوچکی ہیں،نظم کا بھی ایک مجموعہ تیسری آنکھ کے عنوان سے راقم الحروف کی نظر سے گزرچکا ہے لیکن یہ سفریہیں ختم نہیں ہوتا ابھی اردوو ہندی میں نصف درجن کے قریب تالیفات وتصانیف زیرطبع ہیں اورایک درجن تالیفات وتصانیف ہندی واردو میں زیرترتیب ہیں۔ملک کے ہندی واردو رسائل وجرائد میں مختلف شخصیات وموضوعات پراب تک ان کے پچاس سے زائد مقالات و مضامین طبع ہوکرعوام سے خراج تحسین حاصل کرچکے ہیں۔مختلف تنقیدی،افسانوی،شعری اورنثری مجموعوں پرپچاس سے زائد تبصرے ملک کے معیاری رسائل وجرائد میں شایع ہوکرقبولیت عوام کی سندحاصل کرچکے ہیں۔

آج کے دور میں اپنی کتابوں پرتقاریظ وتعارف لکھوانے کی ایک روش عام ہے اوراس وبا سے کوئی بھی بڑا ادیب،نقادونثرنگارمحفوظ نہیں ہے اسے نہ بھی چاہتے ہوئے تعلقات کے جبر کے تحت کسی نہ کسی نثری یاشعری مجموعے پرایک نثری قصیدہ لکھنا پڑتا ہے۔جس سے اکثرسنجیدہ قارئین کی نظر میں اس کی تحریروں کاوزن ووقارمجروح ہوتا ہے اورنہ لکھنے کی صورت میں شہرمیں اس کی بداخلاقی کا چرچا عام ہوجاتا ہے ڈاکٹرشریف احمدقریشی کوبھی ان حالات سے گزرناپڑا ہے اورانہیں بھی درجنوں تصانیف پرتعارف وتقاریظ تحریرکرنی پڑی ہے۔یہاں انہوں نے ایک درمیانی روش اختیارکی کہ مصنف و موضوع کے تعارف میں مبالغہ کے بجائے کافی حدتک حقیقت سے کام لینے کی کوشش کی ہے اوراکثرامور میں فیصلہ قاری کے حوالے کردیا ہے۔

ڈاکٹرشریف احمد نے ملکی سطح کے سیمینار میں بھی مقالے پیش کرکے علمی وادبی حلقوں میں اپناایک علمی وادبی معیارقائم کیا ہے ان کی تحریروں میں اپنی بات

کومتوازن ومعتدل انداز میں مستندحوالوں کے ساتھ کہنے کا جو رجحان دکھائی دیتا ہے وہ ان کے تحقیقی مزاج کی علامت ہے۔

ادبی مشاغل کے علاوہ مختلف تہذیبی،سماجی تنظیموں اورسرکاری وغیر سرکاری اداروں سے وہ اعزازی طور پر وابستہ ہیں جس سے ان کی فعالیت اور جذبۂ خدمت ملک وملت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ان کی اس کثیر الجہت شخصیت کے مختلف فکری وفنی پہلوؤں پر ہندوستان کے مقتدر رسائل و جرائد میں ارباب فکر ونظر اظہار خیال کر چکے ہیں جن میں ان کی شخصیت کے کئی ایسے پہلو سامنے آئے ہیں جن کو پڑھ کر قاری محو حیرت رہ جاتا ہے ان کی اسی انسان دوستی اور خدمت علم وادب کا اعتراف کرتے ہوئے ملک کے مختلف سرکاری وغیر سرکاری اداروں نے انہیں درجنوں انعامات واعزازات سے نوازا ہے۔

ڈاکٹر قریشی کی شخصیت کے تمام پہلوؤں کا اس مختصر مقالے میں احصا کرنا فی الوقت میرا مقصد نہیں،سردست ان کی حالیہ تازہ ترین تصنیف ’کہاوت وحکایت‘ کے تعلق سے اپنے محسوسات ومشاہدات کو بے کم وکاست پیش کرنا ہی میرا مطمح نظر ہے۔

۶۸۷ صفحات پر مشتمل کہاوت وحکایت اردو زبان وبیان سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے ایک ایسی دستاویز ہے جس کی ضرورت محض مجلسی گفتگو میں مہارت وکمال پیدا کرنے کے لئے نہیں ہے بلکہ ہمیں اپنے ادبی وشعری سرمائے سے استفادے اور لاتعداد تلمیحات ومصطلحات کے پس منظر سے کما حقہٗ واقفیت کے لئے بھی ہے۔

ڈاکٹر شریف قریشی نے کہاوت وحکایت کی جمع آوری کے اسباب ومحرکات کو پیش لفظ میں اس طرح بیان کیا ہے ’قصوں اور کہانیوں کے کہنے اور سننے کا دور ختم سا ہو گیا ہے اب نہ قصے کہنے والے ہیں اور نہ سننے والے اگر چہ قصے کہانیوں کے بعض شوقین حضرات پرانے شہروں،قصبوں اور گاؤں میں اب بھی موجود ہیں مگر ان کی تعداد کتنی ہے؟ نئی نسل کو قصوں،کہانیوں اور حکایتوں کا شوق کہاں؟ موجودہ دور میں اسکولوں اور کالجوں کے نصاب میں اخلاقی تعلیم اور سبق آموز حکایات مفقود ہوتی جارہی ہیں جن کے بطن سے بیشتر کہاوتوں کا وجود ہوا بہت سی غیر فرہنگی کہاوتیں اور ان سے متعلق حکایات بزرگوں کے ذریعہ سینہ بہ سینہ ہم کو میسر ہوئی ہیں جیسے جیسے ہمارے یہ بزرگ اور زباں داں حضرات دنیا سے رخصت ہوتے جارہے ہیں ویسے ویسے کہاوتوں اور ضرب الامثال کا چلن بھی کم ہوتا جارہا ہے‘۔

حقیقت تو اس سے بھی زیادہ تلخ ہے ابھی گزشتہ دنوں لکھنؤ جیسے قدیم اردو مرکز میں ایک عزیز کی شادی میں شرکت کا اتفاق ہوا موصوف نے حدیث کساء کے بعد مولانا سے گزارش کی کہ مہمانوں سے کھانے کی گزارش کریں مولانا نے فرمایا آپ تمام حضرات ماحضر تناول فرمانے کی زحمت کریں اس پر ایک بزرگ نے فرمایا یہ ماحضر اور تناول کیا ہے یہ سن کر میں بھی حیرت میں پڑ گیا کہ جب لکھنؤ میں ماحضر اور تناول جیسے الفاظ گلوبلائزیشن کے اس دور میں ہماری زبان سے تقریبا خارج ہوگئے ہیں اور ان کے سمجھنے والے مفقود ہوگئے ہیں تو پھر اس زبان کے ضرب الامثال،محاورات،تلمیحات ومصطلحات کا تو اللہ ہی حافظ ہے۔

الفاظ کے تلفظ کا بھی یہ عالم ہے کہ ہم نے ٹی وی کے اشتہارات کے زیر اثر لذت کے لام کو زیر کے ساتھ بولنا شروع کردیا ہے اور یہ تلفظ کسی اردو سے نابلد طالب علم کا ہوتا تو شاید میں توجہ نہ دیتا اور عام سی بات کہہ کر اسے لائق تذکرہ نہ سمجھتا لیکن یہ عالم ان کا ہے جو اردو زبان وادب سے نہ صرف ایم اے ہیں بلکہ اردو زبان وادب کے معلم ہونے کا فریضہ بھی ادا کررہے ہیں۔

ایسے حالات میں اس طرح کی سعی وکاوش نہ صرف لائق توصیف ہے بلکہ زبان وادب کے تحفظ کی ایک ایسی کاوش ہے جس کی قدر وقیمت کا اندازہ کرنا آسان نہیں۔کہاوت وحکایت میں ڈاکٹر شریف قریشی نے ۱۶۳۰ کہاوتوں کو حروف تہجی کے اعتبار سے جمع کر کے قاری کو تلاش وجستجو میں

زحمت ومشقت سے محفوظ رکھنے کی ہرممکن سعی کی ہے۔قوسین میں ان کہاوتوں کے مآخذ کی نشان دہی کرنے کے بعد ان کے معانی ومفاہیم تحریر کئے ہیں ساتھ ہی ان کے استعمال کے موقع ومحل کی نشان دہی بھی کی ہے تاکہ اردو زبان وادب سے دل چسپی رکھنے والے حضرات آڑے وقت میں ان سے کام لے کر نہ صرف زحمتوں سے بچ سکیں بلکہ اپنی گفتگو میں ان کا برمحل استعمال کر کے اپنے مافی الضمیر کو بحسن وخوبی ادا کرسکیں اور کامیابی وکامرانی کی منزل سے ہمکنار ہوسکیں۔

ڈاکٹر شریف قریشی نے صرف کہاوتوں کے ماخذ، معنی ومفاہیم اور محل استعمال تک ہی اپنے مطالعہ کا دائرہ محدود نہیں رکھا ہے بلکہ ان کہاوتوں کے پس منظر میں جو قصے اور کہانیاں لغات وکتب میں درج ہیں انہیں بھی بیان کر کے اپنی وسعت مطالعہ کا ثبوت بہم پہنچایا ہے اس سلسلے میں انہوں نے تلاش وجستجو کے جن مراحل کو طے کیا ہے اس کا ایک ہلکا سا اندازہ درج ذیل تحریر سے لگایا جاسکتا ہے۔

’متعلقہ کہاوتوں اور قصص وحکایات کو دریافت کرنے کے لئے مختلف لغات، فرہنگیں، کتب، رسائل وغیرہ کو کھنگالنا پڑا ان میں سے بعض کتب ولغت میں چند کہاوتیں ہی ملیں، بعض میں کچھ کہاوتیں اور ان کے معنی ومطالب ہی نظر آئے اور بعض کتابوں کے ذریعہ کہاوتوں کے حکایتی پس منظر ہی ہاتھ آئے، غرض کسی کتاب سے کہاوت کا استخراج کیا تو کسی سے اس کے معنی ومطالب اور کسی سے اس کے حکایتی پس منظر کا، بعض کہاوتوں کے حکایتی پس منظر کے لئے بزرگوں اور قصوں کہانیوں کے شوقین حضرات سے بھی رابطہ قائم کرنا پڑا‘۔

زبان وادب کی دنیا میں کہاوتوں اور حکایتوں کی اہمیت سے انکار ناممکن ہے۔روزمرہ کی گفتگو اور خطابت میں ان کی حیثیت ویسی ہی ہے جیسی شاعری میں محاسن لفظی ومعنوی کی، یہ ضرب الامثال وکہاوتیں نہ صرف انسان کو طول طویل گفتگو سے محفوظ رکھتی ہیں بلکہ گفتگو کے حسن، لطف اور اثر کی کیفیت کو دوچند کرنے میں ممد ومعاون ثابت ہوتی ہیں ان کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے ڈاکٹر شریف قریشی نے تحریر کیا ہے کہ:

’ان میں بذلہ سنجی کے جواہر، دانش مندی کے خزانے اور انسانی تجربات کے بیش بہا گوہر پنہاں ہوتے ہیں ۔کہاوتیں اور ضرب الامثال کسی کارخانے میں ڈھالی نہیں جاتیں، کوئی فرد واحد یا ادارہ انہیں وضع نہیں کرسکتا۔ یہ سینہ بہ سینہ اور پھر کتابوں کے ذریعہ ایک نسل سے دوسری نسل اور ایک ملک سے دوسرے ملک تک پہنچتی رہتی ہیں۔ یہ دراصل وہ سدابہار اشجار ہیں جو نہ صرف بنجر دھرتی کی تہوں کو توڑ کر اگنے کی قوت رکھتے ہیں بلکہ سنگلاخ زمینوں اور پہاڑوں کے سینے چیر کر باہر نکل آتے ہیں۔ یہ ایسے ناتراشیدہ موتی ہیں جو صدیوں تک تراش خراش کے عمل سے گزر کر رواج اور چلن کے ذریعہ تراشیدہ ہیروں کی طرح چمکنے اور دمکنے لگتے ہیں‘۔

ڈاکٹر شریف قریشی نے لفظ کہاوت کے معنی ومفاہیم کے تعین میں ہندی اردو سنسکرت کے مآخذ کو کھنگالا ہے اور کہاوت وضرب المثل یا لوکوکتی کے درمیان جو لطیف فرق ہے اس کی نشان دہی مختلف حوالوں کے ذریعہ کرتے ہوئے ان کے وجود میں آنے کے اسباب ومحرکات پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے جس کے سبب کتاب کی اہمیت وافادیت میں مزید اضافہ ہوگیا ہے ان کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ دنیا کی تمام زبانوں کے ادب میں جو کہاوتیں رائج ہیں وہ سب لوک کہانیوں اور عوامی قصوں کے پیٹ سے پیدا ہوئی ہیں وہ کہتے ہیں کہ:

’حقیقت یہ ہے کہ انسانی تجربات کے پس منظر میں کوئی نہ کوئی حادثہ یا واقعہ ضرور ہوتا ہے جس کو کہانی یا قصے کے روپ میں ڈھالا جاسکتا ہے۔ انہی قصوں، کہانیوں اور حکایتوں کو سماج کا ایک بڑا طبقہ وقت گزاری کے لئے یا اپنی بات کو پر اثر بنانے کے لئے یا پھر لطف اندوز ہونے کے لئے دہراتا رہتا ہے۔جس کے نتیجے میں اس کہانی، قصے یا حکایت کا کوئی کلیدی جملہ، بنیادی لفظ یا مرکزی خیال زباں زد ہوکر کہاوت کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔وہ

فقرے اور جملے جنہیں ہم کہاوت کہتے ہیں اپنے اندر ایک قسم کا اثر، زور اور دل کو چھو لینے کے ساتھ ساتھ دماغ کو جھنجھوڑ نے کی بھی قوت رکھتے ہیں۔ان میں تیزی بھی ہوتی ہے اور تندی بھی، غمگینی بھی ہوتی ہے اور شیرینی بھی، چٹپٹا پن بھی ہوتا ہے اور تلخی بھی، یہ چٹیلی بھی ہوتی ہیں اور زخموں کے لئے مرہم کا بھی کام کرتی ہیں۔

کہاوت و حکایت میں ڈاکٹر شریف احمد قریشی نے جہاں کہاوتوں اور حکایتوں کو حروف تہجی کے اعتبار سے جمع کیا ہے وہیں کہاوتوں کی لفظیات میں موجود فرق کی نشان دہی بھی کی ہے اور ایک ہی کہاوت اردو ہندی یا علاقائی زبان میں جس جس طریقے سے مروج ہے اسے بیان کر کے اپنے مطالعہ کی وسعت اور تحقیقی مزاج کا ثبوت فراہم کیا ہے۔

کہاوت و حکایت کے ایسے بیش قیمت سرمائے کو یک جا کر کے ڈاکٹر شریف احمد قریشی نے نہ صرف ہم اہل زبان کو زیر بار احسان کیا ہے بلکہ انہیں آنی والی نسلوں کے لئے محفوظ کر کے زبان و ادب سے اپنے والہانہ شغف کا بھی ثبوت فراہم کیا ہے نیز اس موضوع پر اردو میں اب تک خاطر خواہ کام کی جو کمی عرصہ سے محسوس کی جا رہی تھی اسے دور کرنے کی کوشش کی ہے۔امید ہے کہ ان کی اس سعی کو نہ صرف ماہرین لسانیات تحسین کی نظر سے دیکھیں گے بلکہ مستقبل میں اسے بنیاد بنا کر تحقیق و تدوین کے نئے باب کشادہ کئے جائیں گے۔

☆☆☆☆☆

(صفحہ نمبر ۱۰ سے آگے)

جناب آقائی دل ایوبی تونکی بروفات حسرت آیات حضرت صولتؔ فرمود

جب تک اردو ہے رہے گا حضرت صولت کا نام
کون ہے جو بھول جائے گا بھلا ان کا کلام
کوئی چاہے بھی تو لے نہیں سکتا ان کا مقام
ان کے فن سے جا نہیں سکتا کبھی رنگ دوام

این شخصیت ارجمند و اعلیٰ آقائی صولتؔ درحقیقت چنان خدمات عظیم الشان وارزندہ ای در زمینہ زبان و ادب فارسی و اردو نمود کہ مصداق این شعر حافظ شیرازی گشت:

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدہ ٔعالم دوام ما

ایزدمتعال بی جنت الفردوس مقام اعلیٰ عطا کناو بمنہ وکرمہ

ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم و تب علینا انک انت التواب الرحیم ربنا آمنا فاغفر لنا وا رحمنا وانت خیر الراحمین بر حمتک یا ارحم الراحمین والحمد للہ رب العالمین

☆☆☆☆☆

رسالہ آفتاب ایک تحقیقی جائزہ

ڈاکٹر ارشد سراج
صدر شعبہ اُردو گورنمنٹ ایس کے کالج سیکر

رسالہ آفتاب ریاست جھالاواڑ راجپوتانہ سے جاری ہونے والا ایک علمی ادبی اور ثقافتی رسالہ ہے آفتاب والیٔ ریاست جھالاواڑ راج رانا بھوانی سنگھ ۱۸۹۹ء سے ۱۹۲۹ء کے عہد میں ۱۹۰۶ء سے ۱۹۰۹ء تک متواتر جاری ہوتا رہا۔اس کے تمام شمارے سید محمد حسین رضوی کی ادارت اور پروپرائٹری میں مطبع احمدی علی گڑھ سے جھالرا پاٹن (جھالاواڑ) سے شائع ہوا کرتے تھے۔اس کے نائب مدیر پرشوتم لال شرما تھے اس کی قیمت عام شائقین سے دو دو روپیہ سالانہ اور طلبہ سے ڈیڑھ روپیہ مقرر تھی' آفتاب' کے تمام مضامین اخلاقی ،تمدنی ،معاشرتی اور تاریخی ہوا کرتے تھے۔سیاسی مضامین کا اس میں قطعی دخل نہ تھا۔آفتاب کے اجراء کا مقصد زبان کی وسعت کے ساتھ ساتھ جدید علوم کے خزائن اس میں منتقل کرنا اور اردو داں طبقہ کی اخلاقی ،تمدنی اور معاشرتی حالتوں سے بحث کر کے سوسائٹی کے نقائص کو دور کرنا ہوا کرتا تھا تا کہ معاشرے کی اصلاح ہو سکے۔

اس مقالے میں ماہ فروری ۱۹۰۷ء کے شمارے کا تنقیدی و تحقیقی جائزہ پیش کیا جاتا ہے تا کہ قارئین کو اس کے معیار اور اہمیت کا اندازہ ہو سکے۔ اس شمارے کا سائز ۲۲x۱۸/۸ ہے اور یہ سرورق کو ملا کر ۳۲ صفحات پر مشتمل ہے۔سرورق نہایت دیدہ زیب اور خوب صورت چوکور بیل سے مزین ہے بیل کے درمیان اوپر کی جانب جلی حروف میں آفتاب درج ہے اس کے ٹھیک نیچے چھوٹے حروف میں رسالہ کا ماہ بابت فروری ۱۹۰۷ء لکھا ہوا ہے۔دائیں جانب بڑے حروف میں جلد ۲ اور بائیں طرف نمبر ا درج ہے۔فہرست مضامین کا آغاز یوں ہوا ہے:

(۱) ہماری نسبت مشاہیر کی رائیں (۲) مضامین آفتاب: ایڈیٹر (۳) خواہشات: ایضا (۴) انسان: عالی جناب مرزا سلطان احمد خاں صاحب بہادر (۵) پہاڑوں کی سرگذشت: جناب المشہدی صاحب متعلم مدرسۃ العلوم مسلمانان علی گڑھ (۶) تنقید: ایڈیٹر (۷) ترجمہ: ولیم ٹیل نظم ایڈیٹر

یہ شمارہ مطبع احمدی علی گڑھ سے شائع ہو کر جھالرا پاٹن میں چھپا ہے سرورق کی دوسری طرف 'ڈرامہ پر ایک دقیق نظر' اور اقبال ٹھگ کے اشتہارات موجود ہیں۔اس کے پہلے مضمون سے ملک کے مشاہیر علم وادب کی آراء کا آغاز ہوتا ہے۔ان میں ہندوستان کے بعض مشاہیر کی آراء کو یہاں بطور نمونہ نقل کیا جاتا ہے جس سے معلوم ہو سکے گا کہ اس زمانے میں آفتاب کو کیا اہمیت حاصل تھی اور اہل علم ودانش اسے کس وقعت سے دیکھتے تھے۔

عالی جناب شمس العلماء مولانا خواجہ الطاف حسین حالی: مکرمی ،رسالہ آفتاب کے دو نمبر پہنچے۔ان کو دیکھ کر طبیعت بہت خوش ہوئی ،اس کو پڑھ کر بے انتہا مسرت حاصل ہوئی۔کیوں کہ ہمارے رئیسوں کا اس طرف متوجہ ہونا ایسی لیاقت سے علمی مضامین لکھنا ہندوستان کے بھلے دن آنے کی دلیل ہے بابو امبالعل صاحب کا مضمون تعلیم پر اور آپ کا مضمون تعصب پر بھی بہت عمدہ مضمون ہیں۔خدا سے امید ہے کہ آفتاب ملک میں چمکے گا۔دل سے دعا کرتا ہوں کہ آپ کامیاب ہوں اور آفتاب کی روشنی تمام راجپوتانہ میں پھیلے (۱) (۱۸/اپریل ۱۹۰۶ء حیدرآباد دکن)

اسی طرح مولوی ذکاء اللہ صاحب دہلوی نے یوں تحریر فرمایا ہے: میں آپ کے محبت نامے اور دو رسالوں کے عنایت کرنے کا شکر یہ ادا کرتا ہوں۔مجھے یقین ہے کہ اگر آفتاب پر والیٔ ریاست جھالاواڑ کی نظر التفات رہی تو وہ اقلیم سخن میں ویسا ہی درخشاں ہوگا جیسا کہ ہندوستان میں سورج بنسیوں کا خاندان تاباں ہوا تھا (۲) (۲۶/اپریل ۱۹۰۶ء)

اسی طرح دیگر مشاہیر ملک کی آراء بھی پیش کی گئی ہیں جن سے رسالۂ ہٰذا کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے بعد ازیں دو مضمون مضامین آفتاب اور دوسرا خواہشات کے عنوان سے شامل اشاعت ہیں جنھیں خود مدیر سید محمد حسین رضوی نے سپرد قلم کیا ہے۔خواہشات مدیر موصوف کا بڑا دلچسپ اور معلوماتی مضمون ہے اس میں انسانی خواہشات کو مختلف اقسام میں تقسیم کر کے علاحدہ علاحدہ ان کا جائزہ لیا گیا ہے۔اس میں انسان کی خواہشات حیوانی ،

خواہش دولت،خواہش حکومت،خواہش سبقت،خواہش تمدن اور خواہش نیک نامی وتحسین کی تشریح وتوضیح بڑے مؤثر انداز میں کی ہے۔جس سے انسانی نفسیات کے بہت سے اہم پہلو سامنے آتے ہیں۔مدیر موصوف نے بہت گہرائی وگیرائی کے ساتھ انسانی خواہشات کی تشریح کرتے ہوئے انسان کے اخلاق کو درست کرنے وتزکیہ نفس کرنے کی ترغیب دی ہے مثال کے طور پر اس مضمون کا یہ اقتباس مزید معلومات کے لئے نقل ہے

'یہ ممکن ہے کہ خواہشات انسان کے دل میں ایک ناجائز اور غیر منظّم حالت میں موجود ہوں اور وہ اپنے طرز عمل پر بعض وجوہات سے ان کا اثر نہ پڑنے دے مثلا پابندیٔ قوانین ملک یا خیال شہرت یا اصول اخلاق کا لحاظ اس کی اندرونی بگڑے ہوئے اصولوں کے ساتھ ہمیشہ دست وگریباں رہے مگر اس حالت کو اخلاقی صحت کی حالت نہیں کہہ سکتے۔اخلاقی طور پر انسان کو صحیح المزاج اسی وقت میں کہا جاسکتا ہے جب کہ اس کی خواہش صحیح اور جائز ہوں اور اس بات کے حاصل کرنے کے لئے تزکیۂ باطن اور تہذیب نفس کی ضرورت ہے'(۳)

بعد ازیں مرزا سلطان احمد خاں بہادر کا انسان کے عنوان سے بڑا دلچسپ مضمون اسی شمارے میں شامل ہے مزید معلومات اور اس کی نوعیت کے لئے چند اقتباسات اس مضمون کے بھی بطور نمونہ پیش ہیں

'نسبتا انسان بمقابلے دیگر جانداروں کے بھی گیا گزرا ہے اور جاندار مخلوق تو مرکر کسی کے کام بھی آسکتی ہے۔ہڈی،چمڑا،دانت کسی نہ کسی مصرف میں آہی جاتے ہیں۔یہ ذات شریف کسی کام نہیں آتے چاہے لوگ خود کام میں نہیں لاتے یا لانے کے قابل نہیں ہوتے مرا اور سڑا دم دیا اور باہر کیا'(۴)

علاوہ اس کے پہاڑوں کی سرگذشت المشہدی صاحب متعلم مدرسۃ العلوم مسلمانان علی گڑھ کا اور حصہ نثر کا آخری مضمون تنقید کے عنوان سے مدیر موصوف کا اس رسالہ کی زینت بنا ہے اختصار کو مدنظر رکھتے ہوئے ان دو مضامین کے اقتباسات نہیں دیئے جارہے ہیں رسالۂ ہٰذا کا آخری حصہ نظم کے لئے مقرر ہے اسی حصے میں مدیر موصوف نے (Villim Tale) ایک انگریزی نظم کا اردو ترجمہ بڑے خوب صورت اور دل کش انداز میں کیا ہے مثال کے طور پر یہاں اس کا ایک بند دیکھئے:

پلا مجھ کو ساقی مئے ارغوانی | کہ ہو جس سے دونا سرور معانی
طبیعت میں آ جائے از بس روانی | بیاں مجھ کو کرنی ہے ٹیل کی کہانی
حقیقی شجاعت دکھائی ہے اس نے | لیٹری کی عزت بڑھائی ہے اس نے

انگریزی نظم کے اس ترجمہ کے بعد ہی رسالۂ ہٰذا کا بھی اختتام ہوا ہے دستور العمل کی مدنمبر ۴ کی فصاحت کے مطابق آفتاب کے اس شمارے میں کسی انگریزی ناول کا ترجمہ شامل نہیں ہے بلکہ انگریزی نظم کا ترجمہ شامل کیا گیا ہے

حواشی:

(۱) رسالہ آفتاب بابت ماہ فروری ۱۹۰۷ء ص ۱ مدیر سید محمد حسین رضوی
(۲) رسالہ آفتاب بابت ماہ فروری ۱۹۰۷ء ص ۲ مدیر سید محمد حسین رضوی
(۳) رسالہ آفتاب بابت ماہ فروری ۱۹۰۷ء ص ۲۲ مدیر سید محمد حسین رضوی
(۴) رسالہ آفتاب بابت ماہ فروری ۱۹۰۷ء ص ۳۰ مدیر سید محمد حسین رضوی
(۵) رسالہ آفتاب بابت ماہ فروری ۱۹۰۷ء ص ۳۲ مدیر سید محمد حسین رضوی

رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر آسمان صحافت کا شب چراغ گوہر

صاحبزادہ شوکت علی خاں

فاؤنڈر ڈائریکٹر اے پی آر آئی ٹونک

نجیب آباد کا نجیب الطرفین، اشرف واعلیٰ، انسب وبالا، نجیب ونصیب والا، شریف ونظیف اسنیٰ وشعریٰ نثریٰ کوموتی ومولانا نے رام پور کو نجیب آباد اور ہندوستان کو تاریخ آزادی کا نجیب آباد، آزاد آباد، محمد آباد اور علی نژاد بنا دیا۔ مولانا محمد علی اسلامیان ہند کے زعیم ونعیم سہی بالا ملک جہانیہان ہندوستان کے سہوم وسہم وضیغم تھے جن سے بکھنگم پیلس تھراتے تھے وائٹ ہاؤس کے درودیوار لرزتے تھے اور ایوان پارلیمان کانپتے تھے وہ اپنی ذات سے فرد فرید لیکن صفات وسمات سے جمہور ونزور وحضور تھے جن سے سلطان جمہور کا دور شروع ہوتا ہے اور بطل حریت کا آغاز ہوتا ہے ملوکیت کا دور ختم ہوتا اور جمہوریت کا دور شروع ہوتا ہے وہ ایک ضعیف البنیان انسان تھا لیکن جنگجو ستم گر فرنگی سہم جاتے تھے وہ ایک غلام ہند کے چھوٹے سے باشندے تھے لیکن ملک وملکوت خوف زدہ ہوجاتے تھے۔ جب وہ زعیم وضیغم غلامِ محمد علی حیدر کرار جو ہر شعلہ باز فلک شگاف تقریر کرتا تھا تو ایوان واعیان واساطین کے کنگورے ہل جاتے تھے۔ جس طرح فاتح خیبر نے در خیبر کو اکھاڑ پھینکا تھا اسی طرح جیسے کسی غلام حیدر کرار نے درودیوار ایوان بالا کو اکھاڑ پھینکا ہوا نہوں نے اپنی شعلہ بار تقاریر اور آتش فشاں تحریر سے اس فرنگی نظام کے پرانچے اڑادیئے جن کی سلطنت باطل آباد میں سورج نہیں ڈوبتا تھا لیکن انہوں نے اپنے نوک قلم اور سحبان زبانی سے حکومت برطانیہ کے درخشاں مناروں ایوانوں دیوانوں اور محلوں کو تاریک الدوام کردیا، وہ رئیس الاحرار شیخ الابرار ہوتے ہوئے ایک غریب الدیار مجاہد آزادی اور خاک وطن عزیز پر مر مٹنے والا ایسا غیور جیالا دلاور سالار تھا جس کے آگے رئیسان اور شاہ نشینان سر جھکاتے تھے، وائے سران نام وران نام وناموس سے بے نیاز ہوکر سرنگوں ہوتے تھے، جب تک اس کا عالم پناہ فلک بارگاہ جریدہ ’’کامریڈ‘‘ comrade نہیں دیکھ لیتے ناشتہ نہیں کرتے تھے۔

وہ قافلہ سالار بے جرس تھا لیکن سالا ران ذیشان ان کو جھک کر سلام کرتے تھے وہ اپنے آقائے نام دار کا ایسا نام ور نام لوا تھا کہ شاہان حشم و خدم اس کے آگے دم بخود ہوجاتے تھے وہ ایسا شاہباز تھا جس کے آگے شاہ گیر ونوابان عالم گیر سہم کر سامنے آتے تھے، وہ ایسا مرد آہنگ تھا جس کے آگے شاہ پور اور شاہ ہنگاں سرنگوں ہوتے تھے اور ایسا شاہ قلم مرد مومن تھا جس کے آگے پیران پیر اور شاہکاران جہاں دم بھرتے تھے وہ اس مسند رشاد پر متمکن تھا جس کی بارگاہ میں احرار وابرار واخیار آنکھیں بچھا کے استقبال کرتے تھے وہ ایسا غیور مرد مومن تھا جس کو غرائب وعجائب وضو کراتے تھے وہ ایسا شاہ مرداں تھا جس کے آگے شاہ وگدا اور امیر وفقیر کمر بستہ کھڑے رہتے تھے اگر میں یہ کہوں تو بے جانہ ہوگا کہ وہ تو اپنے کارہائے نمایاں سے سراپا شاہ نامہ شاہان شایاں تھا، مولانا مودودی نے کیا خوب تبصرہ کیا ہے ’’محمد علی کارساز زعیم غلام آباد ہندوستان نے شاید کوئی نہیں پیدا کیا وہ گدائے بے نوا تھا لیکن آغا خان اور مہاراجہ محمود آباد اس کے حضور جھک کر آتے تھے، وہ اقلیت کا ایک فرد تھا لیکن اکثریت کا سب سے بڑا لیڈر گاندھی اس کی پشت پر تھا اور پٹیل، موتی لال، جواہر لال، راجندر پرساد وغیرہ تو اس سے دوسرے ہی درجے پر تھے وہ ایک غلام ملک کا باشندہ تھا لیکن دنیا کی سب سے بڑی سامراجی حکومت اس سے ڈرتی تھی وہ بڑی آسانی سے انگریزی دور میں کم از کم وائسرائے کی Executive Council کا منبر بن سکتا تھا لیکن ان مناصب عالیہ پر اس نے کبھی نگاہ غلط انداز ڈالنا بھی گوارہ نہ کیا اس کی زندگی کا مقصد منہاج خلافت راشدہ پر خلافت کا قیام تھا وہ پابندی سے نماز پڑھتا تھا پابندی سے روزے رکھتا تھا اور ذات رسالت مآب سے اس کے عشق اور شیفتگی کی یہ کیفیت تھی کہ۔

جب نام ترا لیجئے تب چشم بھر آوے

اس کی دوستی بھی اللہ کے لئے تھی اور دشمنی بھی اللہ کے لئے اس لئے وہ دوستوں کو دشمن اور دشمن کو دوست بنا تا رہا''

مولانا محمد علی جوہر اور ان کے بڑے بھائی مولانا شوکت علی نے علی گڑھ میں تعلیم و تربیت پائی دونوں علی برادران نے اپنی جوہر بیز لیاقت و صلاحیت سے نام پیدا کیا اور آخر میں وہیں جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنیاد ڈالی اور خیموں میں درس گاہ چلائی جس کے اولین طالب علم ٹونک کے ہی نام ور محمد یوسف صدیقی تھے، جو یوسف میاں کے نام سے مشہور ہیں، ناموری حاصل کی اسی دور میں وہ صحافت کے ایسے دلاور مرد میداں نکلے کہ ان کے مقالات کی پورے ہندوستان میں دھوم مچ گئی انہوں نے مسلسل انگریزی اخباروں میں Times of India, Punjab Review, Indian Indian Spectator, Lahore Observer زوردار انشا پردازی اور صحافت کے اس جوہر گوہر بار نے وہ جوہر دکھائے کہ دنیا کے عدیم المثال صحافی بن گئے۔

یکم جنوری ۱۹۱۱ء تاریخ ساز ایسا وقت محکم تھا جب انہوں نے کلکتہ سے ایک ہفتہ وار انگریزی اخبار Comrade نکالا جس نے ان کو فرش زمین سے اٹھا کر فرش سمائے بالا پر بٹھا دیا اسی کے ساتھ اردو میں بھی انہوں نے ایک اخبار 'ہمدرد' جاری کیا دونوں اخباروں نے برطانوی حکومت پر ایسے جارحانہ اور قاہرانہ حملے کئے کہ حکومت برطانیہ عاجز و حاجز ہوگئی، یہ اخبار نہیں محضر نامے تھے ظلم و تشدد و تسلط جابرانہ کے خلاف الفاظ و معانی کے تیر و تفنگ اور اتواب و اضراب تھے برق و رعد کے دہشتناک غلغلے تھے اور غضبناک اور محشر بپا یلغار و پیکار کے آوازے اور دل ہلانے والے نعرہ ہائے تکبیر تھے، جس سے حکومت کے تاج و تخت و بخت و رخت و نخوت میں زلزلت آنے لگے اور سامراجی طاقتیں ہلنے لگیں بالآخر دونوں اخباروں کو بند کر دیا گیا اور علی برادران مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی کو قید و بند کی صعوبتوں میں زندگی کے صبح و شام و لیل و نہار گذارنے پڑے اولین جنگ عظیم ۱۹۱۴ء میں ترکی نے جرمنی کا ساتھ دیا اس کی پاداش میں لندن ٹائمز London Times نے Choice of Turk ایک اداریہ لکھ مارا اس کے جواب میں مولانا محمد علی رئیس الاحرار نے اپنے کامریڈ میں اسی عنوان سے ایک دنداں شکن اور مسکت جواب دیا، ان کا یہ اداریہ بیس کالموں پر مشتمل تھا جو چالیس گھنٹوں میں مسلسل بیٹھ کر لکھا گیا تھا جس کے لئے وہ فرماتے تھے کہ میں نے یہ لکھ کر اپنی موت کے وارنٹ پر دستخط کر دیئے تھے ان اخباروں نے ہندوستان میں انقلاب برپا کر دیا اور ہر ہندوستانی طوفان خیز اور عالم پناہ بن گیا اسی روز محشر بپا سے برطانیہ کا نصف النہار پر آیا ہوا سورج ڈھلنے لگا صحیح معنی میں ان اخباروں نے ہی آزادی کے خواب پریشاں کو شرمندۂ تعبیر کیا تھا جو کام البلاغ اور الہلال نہیں کر سکے وہ 'کامریڈ' اور 'ہمدرد' نے کر دکھایا۔ آزادی تو اسی دن مل گئی تھی جس دن یہ اخبار بند ہوئے اور علی برادران قید ہوئے تھے ہم تو اس وادیٔ پر خار میں بہت بعد میں آئے ہیں ۴۵ ہزار علماء شہید کر دیئے گئے سینکڑوں نہیں ہزاروں گھر برباد و ویران ہو گئے ہزاروں کے سہاگ اجڑ گئے ہزاروں خانماں برباد ہو گئے ہزاروں بے نام و نشاں سولی پر چڑھا دیئے گئے، یہی 'ہمدرد' و 'کامریڈ' حریت کے پرچم ہلالی تھے جس کا ایک ایک ورق خوں چکاں کفن کی لالی سے تعبیر تھا اور آزادی ہند کا ایک ایک پرچم جم شاہی اور نشان رنگ و آہنگ کا سہیم نظامی اور سپہر شکوئی کا زعم جہاں بانی اور امم نگہبانی تھا اور اب تک بھی وہ ہی ایک ایک ورق ہماری آزادی کا پرچم ترنگا بن کر شاہ برجوں دیوانوں بلند و بالا ایوانوں، لال قلعہ، قطب مینار سپہر شکوہ ہمالہ کی شان و شوکت بنا، بی اماں علی برادران شاہ گوہر مولانا محمد علی جوہر کو خراج عقیدت پیش کر رہا ہے۔

یہی رئیس الاحرار محمد علی جوہر ناموس وطن پر مر مٹنے والا جیالا مرد آہنگ تھا جس نے ہندو مسلم اتحاد کو تاریخ ہند کا جلی عنوان بنا دیا اور اپنے ابنائے وطن کے خون ناحق سے اپنے اخباروں کی سرخیاں لکھ کر فرنگی نظام آمریت کے تار و پود اکھاڑ پھینکے یہ ہی مرد مجاہد تھا جس نے گاندھی جی کو مہاتما اور آزادی کا

سر بلند علم بردار بنایا یہی وہ شیر دل آزادی کا متوالا تھا جو گاندھی جی کو اپنی پیٹھ پر بٹھا کر جامع مسجد شاہ جہانی میں لے گیا اور ولولہ انگیز شعلہ بار ایسی تقریر کی کہ ہندو مسلم ایک ہو گئے اور عوام میں خود اعتمادی استبدادی طاقتوں سے زور آزمائی کی جرأت رندانہ اور سرفروشی کی تمنائے لازوال اور قومی ملی جذبۂ اخوت پیدا ہو گیا، مولانا محمد علی جوہر کا آزادیٔ ہند کا محضر نامہ تھا جوان کی موت کا سرنامہ بن گیا انہوں نے لرزتے دستہائے تیغ آشنا پیچ وخم سے نالہ کناں لب ہائے خوں فشاں سر شکہائے جوہر پیکاں سے ایسی ولولہ خیز اور قیامت خیز تقریر کی کہ پروانۂ آزادی کی نوید نوبہار اور خوش خبریٔ بہجت شعار تو وہیں مل گئی تھی ان کے دل ہلانے والے کلمات کوہ کن وظلمات شکن یہ تھے ''جب تک مجھے پروانۂ آزادی نہیں مل جاتا میں وطن واپس نہیں جاؤں گا میں ایک غلام ملک میں واپس نہیں جاسکتا میں ایک غیر لیکن آزاد ملک میں مرنے کو ترجیح دوں گا اگر تم ہندوستان میں آزادی نہیں دے سکتے تو پھر تمھیں اپنے ملک میں میری قبر کے لئے جگہ مہیا کرنی ہوگی'' یہ کہتے کہتے وہ بے ہوش ہو گئے اور چند دن بعد ہی لندن میں ان کا انتقال پر ملال ہو گیا اور آزادیٔ ہند کا یہ مرد مجاہد اسداللہ جذبہ سے سرشار بندۂ رجال الغیب ضیغم زعیم خاک پاک بیت المقدس میں سپرد خاک ہوا اور بقول اقبال جلیل وجلال

خاک قدس او را با آغوش تمنا در گرفت سوئ گردون رفت زان راہی کہ پیغمبر گذشت

وہ آزادی کا باب ہی ختم ہو گیا وہ اسداللہ نعرے ہی ختم ہو گئے وہ داستان آزادی ہی ختم ہو گئی، وہ طوق وسلاسل ٹوٹ گئے اور ہندوستان آزاد بھی ہو گیا لیکن آزادی دلانے والا حیدر دل آسماں آستاں شیر افگن باطل شکن حریت فگن بندۂ ذوالمنن ایسا سویا کہ ہم نے اس کو ایسا بھلایا کہ تاریخ آزادیٔ ہند سے اس کا نام ہی مٹا دیا، ان کا کیا مٹایا خود ہم ہی مٹ گئے، وہ انفجار سحر ہویدا ہوا وہ نور کی کرنیں پھوٹیں وہ صبح بہاراں آئی وہ اجالا ہوا وہ آزادی کا لہرایا پرچم ہلالی لیکن وہ سویا بزم ہلالی کا پاسباں وطن عزیز کا نگہباں مرد مومن مجاہد آزادی کا قافلہ سالار ذیشان مرد اخوان المومنین اور شیر دل رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر گوہر فشاں زواہر نشاں شوکت شاں بی اماں، اماں جو خود آزادی کے علمبردار ہی نہیں تھے خود آزادیٔ حریت کے پیکر سراپائے اخوت وشان و شوکت تھے اب کی موت سے آزادی ملی لیکن آزادی کے تازیانے بجتے رہے پرچم ہلالی اڑتے رہے قومی ترانے بجتے رہے آزادی زندہ باد کے نعرے گونجتے رہے ہندوستان پائندہ باد کے آوازے فلک بوس ہوتے رہے لیکن ہم اس فلک پایۂ سپہر شکوہ آسماں آستاں خانہ زاد محمد علی جوہر کو بھولتے گئے اور بھولتے گئے اور بھولتے گئے۔

مولانا محمد علی جوہر گوہر صفت عظمت بخت صفوت نظرت علی نسبت نخبت جمیعت فضیلت بخت ایک شخصیت کا مالک نہیں کئی متخصص شخصیات ان میں جلوہ گر تھیں وہ کیا کیا تھے اور کیا کیا نہیں پر وقار انشاء پرداز شاعر دل نواز خطیب وافر نصیب تقار فخار ادیب سحباں فخر خاندان شاہوار ان مجاہد دل فگار ان سراپا انجمن آرائے بزم ورزم محرم راز ہائے تجلیات مسیحائے زمین وزمن جاں نثار وطن، مرد مومن ممتاز وماہر شعر وسخن، واقف دقیقہائے صحافت اشاعت و نظارت موجد محاورات وواجبات ادب العالیہ زبان وبیان فصاحت وبلاغت پر انگریزی اور اردو دونوں میں اتنا عبور وتبحر وتصرف تھا کہ وہ جہلا سے علماء تک عوام وجمہور سے لے کر امراء ووزراء وشرفا تک ہر ایک کے زبان وبیان مصطلحات ومحاورات نفس مضمون اسلوب وتراکیب طرز ادا زبان وبیان پر قدرت تامہ اور مدخل کامل رکھتے تھے انگریزی زبان میں تو انہوں نے محاورات تک ایجاد کئے تھے لیگ آف نیشنز League of Nations کے ایک اجتماع میں ایک مقرر جوان کے بعد تقریر کرنے والے تھے اور مولانا کے بعد بولنے والے تھے ان سے پہلے بولنے لگے مولانا ذرا دیر سے آئے راستہ اوپر سے نیچے آنے کا تھا مقرر نے گھبرا کے کہا O You Have Come مولانا نے اوپر سے دیکھتے ہوئے فوراً فرمایا Yes have come to look down upon you اس طرح انگریزی ادب کے وہ اپنے وقت کے یگانۂ روزگار اور نابغۂ وقت انشاء پرداز اور ادیب بے نظیر تھے۔ (بقیہ صفحہ ۵۶ پر)

احتشام حسین کی مکتوب نگاری

ڈاکٹر اکبر مہدی مظفر
اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اردو،
ساکیت پی.جی.کالج،اجودھیا،فیض آباد

پروفیسر سید احتشام حسین کا شمار ترقی پسند تحریک کے مستند و معتبر ترین نقادوں میں ہوتا ہے ان کے تنقیدی تصورات روز روشن کی طرح واضح تھے کیونکہ انھوں نے زبان و ادب کی تنقید اور افادیت کے تعلق سے کبھی مصلحت پسندی سے کام نہیں لیا غالباً اس کا ایک سبب یہ تھا کہ ان کے سامنے متقدمین کے چند مصلحت آمیز ادبی تصورات تھے جن سے وقارِ تنقید مجروح ہونے لگا تھا۔ان کی ابتدائی تحریروں کے زبان و اسلوب کو دیکھنے سے یہ تصور ابھرتا ہے کہ انھوں نے ترقی پسند تحریک کے منشور،مقصدیت اور تصورات کی حمایت کرنے میں حالانکہ تھوڑے سے احتیاط سے کام لیا لیکن جب ایک بار اُن تصورات پر اپنی رائے قائم کر لی اور عملی تنقید کا دامن تھام لیا تو تا زندگی اس پر اپنی گرفت بنائے رکھی اور کسی دوسری جانب نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ان کی تنقیدی تحریریں مدلل،انداز بیان سلجھا ہوا،زبان پاک صاف،اسلوب نکھرا ہوا ہوتا ہے جس سے ان کی تحریروں میں ایک انفرادی شان پائی جاتی ہے۔انصاف سے کام لیا جائے تو ہمیں ان کی شخصیت میں بھی وہی اعتدال،توازن اور ہم آہنگی نظر آئے گی جو ان کی تحریر سے عیاں ہوتی ہے۔اس تمہید یہ گفتگو میں سید احتشام حسین کے جن فنی اوصاف کا ذکر کیا گیا وہ تمام اوصاف ان کے مکتوبات کے بھی جوہر خاص ہیں۔

ادبی تصورات کو مستحکم کرنے میں انسان کے اخلاق اور کردار کا بھی بڑا دخل ہوتا ہے۔علم و تعلّم اور اخلاق و کردار کا حسین مرکب ہی شخصیت میں چار چاند لگاتا ہے۔اس کلیہ کی روشنی میں احتشام حسین کی شخصیت ایک مکمل شخصیت تھی۔اچھا انسان ہونے کے اس پیمانے پر سید احتشام حسین کھرے اترتے ہیں جس میں خلق،ہمدردی،مروت،خندہ پیشانی شامل ہیں۔مذکورہ تمام خصائل ان مختلف خطوط سے واضح ہوتے ہیں جو انھوں نے اپنے دوستوں ،شاگردوں اور مختلف شعبہ حیات سے متعلقہ افراد کو لکھے تھے۔ان کے بعض خطوط سے مہر و محبت ٹپکی پڑتی ہے۔نامانوس اور اجنبی افراد کو بھی ان کے خطوط کے جواب میں ایسے محبت آمیز جملے لکھ دیتے ہیں کہ مکتوب الیہ کو یقین ہی نہیں ہوتا کہ یہ وہی احتشام حسین ہیں جن کو ترقی پسند تنقیدی تصورات کا ثابت قدم علمبردار کہا جاتا ہے۔جس زمانے سے احتشام حسین کا تعلق ہے وہ زمانہ ترقی پسند تحریک کے عروج کا زمانہ ہے لیکن انھوں نے اپنے خطوط میں شاذ و نادر ہی اپنے ان نظریات کا دم بھرا ہو جس کے وہ حامی تھے۔

مکتوب نگاری کا عام مزاج یہ ہوتا ہے کہ اس میں زیادہ سے زیادہ حقیقی اطلاعات مکتوب الیہ کو بیک وقت فراہم کر دی جائیں۔احتشام حسین نے اپنے مکتوبات میں اس روایت کا لفظ بہ لفظ خیال رکھتے ہوئے خطوط کی فضا کو ابر آلود ہونے سے بچانے کی حتی الامکان کوشش کی۔انھوں نے مکتوب الیہ کے حسب فرمائش ہی خطوط کا جواب لکھنے اور اس کے ہر سوال کا جواب دینے کی پوری کوشش کی تاکہ مکتوب الیہ مطمئن ہو سکے۔احتشام حسین کی زندگی کا منبع و مقصد انسان دوستی اور خدا ترسی بھی تھا اپنی پوری زندگی میں انھوں نے شاید ہی کبھی کسی سے تلخ کلامی یا اونچی آواز میں گفتگو کی ہو اور یہی وصف ان کے مکاتیب میں بھی نظر آتا ہے۔ان کے نزدیک کسی کی دل شکنی کرنا گناہ عظیم کے مترادف ہے۔کوئی انجان شخص بھی اگر ان سے کسی مدد کا طالب ہوا تو انھوں نے مدد سے کبھی گریز نہیں کیا حتیٰ کہ وہ انجان شخص ہی کیوں نہ ہو یا وہ کسی تیسرے شخص کی سفارش سے ہی مدد کا طالب کیوں نہ ہو۔اس سلسلہ میں شارب ردولوی نے لکھا ہے:

''ان کے لغت میں 'نا' کا لفظ نہیں تھا اس کی وجہ سے اکثر وہ پریشان بھی ہوتے تھے لیکن کیا کریں کہ انکار کرنا ان کی فطرت میں نہیں تھا۔ ہر شخص ان کے پاس اپنا مجموعہ کلام یا جو کچھ بھی لکھا ہے لے کر آ جاتا کہ اس پر پیش لفظ لکھ دیجئے اور وہ لکھ دیتے''(۱)

اس بابت احتشام حسین نے اپنا نظریہ بھی واضح کرتے ہوئے کہا تھا:

''یہ صحیح ہے کہ میں ہر ایک کی کتاب پر لکھ دیتا ہوں۔ان کی ہمت افزائی کے جملے لکھنا غلط بات نہیں ہے اگر میں یہ نہیں کروں گا تو نئی نسل اپنی توانائی کا اظہار کس طرح کرے گی اور ادب کا یہ کاروان کن کے قلم کے سہارے آگے بڑھے گا''(۲)

احتشام حسین کا یہی نظریہ ان کے مکاتیبی سلسلہ میں بھی عیاں ہے اور غالباً اسی جذبے کے تحت انھوں نے ہر خط کا جواب دینا اپنے ذمے لازم سمجھ لیا تھا چاہے وہ خط کسی اجنبی نے ان کو کسی مدد کے سلسلہ میں تحریر کیا ہوا یا ان کے کسی شناسا نے از راہ التفات لکھا ہو۔اپنے کسی شناسا کو خط لکھنے میں کسی قسم کے تکلف سے کام نہیں لیتے اور نہ کسی مصنوعی لقب سے یاد کرتے ہیں جس سے **Formality** کا شائبہ ہو۔اپنے شاگردوں کو بھی عزیزم سے مخاطب کرتے ہیں اور دوستوں سے ایک حد تک ہی بے تکلفی کا اظہار کرتے ہیں تا کہ احباب کے آبگینوں کو ٹھیس نہ پہنچے۔ایسے خطوط کی شان دیکھنا ہو تو ان کے دوست سلام مچھلی شہری کے نام لکھا گیا ایک خط ملاحظہ کیجئے:

۱۰/ دسمبر ۱۹۴۱ء،لکھنؤ یونیورسٹی،لکھنؤ

محبی سلام صاحب

حسین گرفتاری'' مبارک ہو۔بعض مجبوریوں کی بنا پر حاضر نہ ہو سکا پھر میرا بچہ بیمار رہا،ابھی تک ٹھیک نہیں اس لئے جواب دینے میں تاخیر ہوگئی۔شادی کے بارے میں مَیں اب تک کوئی رائے قائم نہیں کر سکا ہوں۔اگر دعا کا قائل ہوتا تو ضرور یہ دعا کرتا کہ انجام بخیر ہو۔ہندستان میں شادی کا معاملہ یہ ہے جیسے کوئی اندھیرے میں تیر چلائے۔کامیابی اور ناکامی اتفاق پر مبنی ہیں۔ آپ بہت حساس ہیں اِس لئے آپ کے لئے شادی اور اہم مسئلہ کی صورت میں آئی ہوگی مگر بھائی میں نے کسی سے سنا تھا کہ یہ شادی سچ مچ شادی ہی ہے گرفتاری ہے نہیں پریم بندھن ہے۔خدا کرے ایسا ہی ہو۔

ریڈیو کا مشاعرہ مختصر ہونے کی وجہ سے کم لوگوں کو دعوت دے سکا۔مجھے اُس میں صرف ایک پارٹ ادا کرنا تھا،اس کے منتظموں میں نہیں تھا۔

مخلص:احتشام حسین(۳)

مذکورہ مکتوب میں سید احتشام حسین نے شادی کے سلسلہ میں اپنے جن خیالات کا اظہار کیا ہے اس سے زیر لب تبسم کی فضا پیدا ہوتی ہے اور اس کا بھی احساس ہوتا ہے کہ وہ زندگی کے اس عظیم مرحلہ کو کس شوخی اور چہل سے سمجھنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔شادی کو 'حسین گرفتاری' کی ترکیب کے طور پر پیش کرنے کا ہنر غالباً اس کا پتہ دیتا ہے کہ وہ زندگی میں مزاح کو کتنی اہمیت دیتے تھے۔سلام مچھلی شہری نے جب احتشام حسین کو پہلا خط لکھ کر ملاقات کی خواہش کی تھی تو احتشام حسین نے ان کو خط لکھ کر حوصلہ بخشا تھا کہ وہ ان سے ناآشنا نہیں ہیں بلکہ ان کو مختلف ادبی رسالوں میں پڑھتے رہے ہیں

وہ خط بھی ملاحظہ ہو جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ احتشام حسین نے کبھی کسی کو مایوس نہیں کیا اور نہ ہی کسی دل شکنی کا سبب بنے:

۱۴/ مارچ ۱۹۴۱ء، بارود خانہ۔لکھنؤ

محترمی تسلیم

آپ کا مختصر کارڈ ملا۔ اگر کسی سے ملنے کا جی چاہے تو پھر تعارف کی ضرورت کیا ہے۔ آپ تو اکثر لکھنؤ آتے رہتے ہیں۔ اب جب آپ تشریف لائیں تو ضرور ملاقات کروں گا بشرطیکہ مجھے آپ کے ناتے کا علم ہو جائے۔ مجھ سے ملنے کی خواہش شاید اس لئے ہوگی کہ آپ ہر اُس نوجوان میں جسے علم وادب کے نئے رجحانات سے دلچسپی ہے کوئی ذوقِ مشترک پاتے ہوں گے اور ممکن ہے کہ آپ مجھے بھی ایسا ہی سمجھتے ہوں۔ ویسے تو آپ سے تعارف نہیں لیکن آپ کی نظمیں نیا ادب، اضطراب، ادبی دنیا میں دیکھتا رہتا ہوں اور ایک ادبیات سے دلچسپی لینے والے کی حیثیت سے غائر نظر سے دیکھتا ہوں۔

آپ کی مختصر تحریر میں جو اضطراب ہے اس نے مجھے قہقہہ لگانے پر نہیں بلکہ سوچنے پر مجبور کیا۔ مجھے سوشلزم سے دلچسپی ضرور ہے لیکن یہ نہیں جانتا کہ سوشلسٹ مفکر ہوں بھی یا نہیں۔ بہر حال سوشلزم ہی کو صحیح راستہ جانتا ہوں۔

مخلص: احتشام **(4)**

احتشام حسین کے بعض خطوط ایسے بھی ہیں جن سے ان کے مزاج کی سنجیدگی اور متانت کا علم ہوتا ہے۔ وہ بہت کم گو تھے لیکن جہاں ضرورت ہوتی تھی وہاں اپنی رائے بے دھڑک رکھتے تھے اور اس پر قائم بھی رہتے تھے۔ ذاتی خطوط میں سنجیدگی اور متانت کی گنجائش اسی وقت ہوتی ہے جب کوئی بہت اہم مسئلہ درپیش ہو۔ انھوں نے اپنے شاگردوں کو بھی خطوط لکھے تو اس سے بے انتہا مروت جھلکتی ہوئی نظر آئی ہے اس سلسلہ میں ان کے شاگرد عزیز محمد حسن کو لکھے گئے خط کو پیش کیا جا سکتا ہے:

۱۴/ اگست، بارود خانہ۔لکھنؤ

عزیزم، دعائیں

کل خط ملا، خوشی کی بات ہے کہ آپ کسی حد تک بمبئی کے سفر اور اس کے امکانات سے مطمئن ہیں۔ ۶/ اگست کی صبح کو میں سو کر اٹھا تو پیٹ میں ہلکا ہلکا درد تھا، آٹھ بجتے بجتے بہت بڑھ گیا، معلوم ہوا کہ **Renelcolic** ہے۔ انجکشن وغیرہ ہوئے، درد سے تو شام تک نجات مل گئی لیکن اب تک ٹھیک نہیں۔ کاہلی اور بے دلی کا یہ حال ہے کہ ہر روز صبح اور شام ڈاکٹر فریدی سے ملنے کا ارادہ کرتا ہوں اور رہ جاتا ہوں۔ پہلے بھی علاج کی طرف دیر میں طبیعت مائل ہوتی تھی لیکن فرق یہ ہے کہ پہلے معمولی تکلیف کا خاطر میں لانا بزدلی معلوم ہوتا تھا اور اب کاہلی اور دوسرے افکار راہ روکتے ہیں۔

مجھے تو بالکل یقین ہے کہ اگر بہت سے دوسرے مصالح حائل نہ ہوں تو آپ کی چیزیں، رائیں اور تجویزیں فلمی دنیا والے ضرور پسند کریں گے۔ سہراب کے متعلق معلوم نہیں آپ نے کیا رائے قائم کی۔ مجھے تو ایسا محسوس ہوا تھا کہ آدمی اچھے ہیں لیکن انا زیادہ ہے۔ شاید اس خود اعتمادی کے بغیر مقابلوں کی دنیا میں کام بھی نہیں چل سکتا۔ نمی کی سادہ مزاجی نے مجھے بھی متاثر کیا تھا، ذرا دیر کے لیے محبوب ہی کے اسٹوڈیو میں ملاقات ہوئی تھی۔ محبوب مجھے ذہین اور فنکارانہ حس رکھنے والے انسان

معلوم ہوئے۔ یہ مغنی جن کے یہاں آپ نے دعوت میں شرکت کی کون مغنی ہیں، وہی تو نہیں جنھیں میں جانتا ہوں۔ وہ بھی اچھے آدمی ہیں۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ غالب جلد تیار ہو جائے گی۔ معلوم نہیں کس نے کہانی لکھی ہے اور کیسی ہے؟

عباس آپ سے اچھی طرح واقف ہیں۔ تعارف کی ضرورت نہیں، میں یوں بھی چین میں اردو پڑھانے والے سلسلہ میں آپ کا ذکر کر چکا ہوں اور یہ بھی ہے کہ وہ پڑھتے رہتے ہیں اور آپ سے واقف ہیں۔ یوں بھی وہ اتنے معقول انسان ہیں کہ چاہے مدد نہ کر سکیں لیکن ملیں گے خلوص سے۔ میرا بہت سلام کہئے گا۔ کرشن چندر، ساحر، بیدی وغیرہ سے بھی ملاقات ہو تو سلام کہئے گا۔ مدت سے ان حضرات سے ملاقات نہیں ہوئی۔ سرور صاحب سے آپ کا سلام کہہ دوں گا، شکایت بھی پہنچا دوں گا لیکن غالباً وہ یہی جواب دیں گے کہ طالب علموں نے سب کچھ اچانک طے کیا اور بالکل موقع نہ ملا کہ کسی کو اطلاع دی جائے میں تو اسی دن بیمار ہوا تھا۔

علی گڈھ کے متعلق ابھی قطعی اطلاع تو نہیں، خلیق نقوی آئے تھے (وہاں شعبہ معاشیات میں لیکچرر ہو گئے) کہہ رہے تھے کہ ۲۶/ اگست تک کچھ ہونے کی خبر تھی انھیں کچھ زیادہ معلوم نہیں تھا۔ ابھی تک سرور صاحب کے پاس کوئی خط نہیں آیا۔ اگر عارضی جگہ کا معاملہ ہے تو میری رائے میں اس کے لیے فکر مند رہنا فضول ہے حالانکہ جتنی دیر ہوتی جائے گی اسی قدر آپ کے یونیورسٹی میں پہنچنے کے امکانات کم ہوتے جائیں گے۔ مجھے کوئی اطلاع ملی تو لکھوں گا۔ ریڈیو اسٹیشن پر ابھی کوئی اطلاع نہیں۔ میں احتیاطاً کل پھر پوچھ لوں گا۔ یہاں اس وقت لوگ سب سے زیادہ بچوں کی پراسرار بیماری کی وجہ سے پریشان نظر آتے ہیں۔

دعا گو: احتشام حسین **(۵)**

اس خط سے یہ بات بھی ثابت ہو جاتی ہے کہ اس خط کی زبان میں کسی قسم کی جذباتیت حاوی نہیں ہے۔ جتنی بھی اطلاعات فراہم کی گئی ہیں ان میں سے کسی کے متعلق کسی قسم کا شبہ پیدا نہیں ہوتا۔ جتنے بھی الفاظ انھوں نے لکھے ہیں اس کا خاص تاثر ہے۔ خط کی فضا بوجھل نہیں ہوئی ہے اور مکتوب الیہ کی دلچسپی کا خیال رکھتے ہوئے اس کے حسب منشا اطلاعات فراہم کی ہیں۔ انھوں نے اپنے شاگردوں کو بھی عزیزم سے خطاب کر کے ثابت کیا ہے کہ شاگردوں کی حوصلہ افزائی سے استاد کی ادبی شناخت متعین ہوتی ہے اور اس کی مثال خود ڈاکٹر محمد حسن ہیں جنھوں نے تا زندگی احتشام حسین کی شاگردی اور ان کی سرپرستی کا ذکر کیا۔

احتشام حسین کی دیگر ادبی مصروفیات میں مختلف یونیورسٹیوں کے امتحانات لینا (پی ایچ ڈی مقالہ کے ممتحن کے طور پر) بھی شامل تھا جس میں شامل ہونے کے لیے وہ مصیبتیں بھی اٹھا لیتے تھے اور عدیم الفرصتی کے باوجود بلائے جانے پر پہنچتے ضرور تھے اور سفر میں پیش آنے والے مسائل اور پریشانیوں کا مقابلہ بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ اٹھاتے نظر آتے تھے لیکن دبی زبان سے بھی اس کی شکایت نہیں کرتے تھے۔ اس زمانے کے حیران کن سفر کے بابت ان کو مختلف مواقع پر جسمانی تکالیف کا بھی سامنا کرنا پڑا لیکن ان کا ادبی سفر کبھی رکتا نہیں تھا اور وہ اپنے دوستوں کو بھی اس بات کی تلقین کرتے تھے کہ جب کوئی یونیورسٹی آپ سے کوئی ادبی کام سرانجام دینے کی گزارش کرے تو اس کو بغیر کسی جبر کے قبول کیجئے۔ آپ کے اس طریق کار سے اردو زبان وادب کو فروغ ہی ملے گا۔ ان کی ادبی مصروفیات سے متعلق مندرجہ ذیل تین مزید خطوط ملاحظہ ہوں جنھیں کلام حیدری کے نام تحریر کیا گیا ہے:

۱۵/ مئی ۱۹۶۳ء لکھنؤ یونیورسٹی لکھنؤ

عزیزم تسلیم

ابھی آپ کا خط ملا۔ مجھے شرمندگی ہے کہ اس سے پہلے نہ لکھ سکا۔ اُس دن آپ سے رخصت ہو کر پٹنہ پہنچا تو اسٹیشن پر سہیل صاحب اور رمن صاحب مل گئے ۔ میں سیدھے اختر صاحب کے یہاں چلا گیا۔ ساڑھے پانچ بجے جلسہ گاہ میں پہنچا۔ گورنر صاحب نے افتتاح کیا، پھر ڈاکٹر بدیشور پرشاد نے ایک مضمون لکھ کر بحث کا آغاز کیا تین چار آدمیوں نے تقریریں کیں،ان میں میں بھی تھا۔ میں نے اس پر زور دیا کہ اس وقت ادیبوں کو اپنے اختلافات نظر انداز کر کے ان باتوں پر مشترک ہونا چاہیے جن سے امن اور ترقی کی طاقتوں کو تقویت پہنچ سکتی ہے۔ ہندی کے جیندر کمار نے کسی قدر بے تکی اور انفرادیت پسندانہ تقریر کی۔حکومت پر اعتراضات کئے وغیرہ۔ دوسرے دن صبح کے جلسہ میں اس پر بھر بحثیں ہوئیں، میں نے ایک تقریر اور کی، سہ پہر کو میں نے صدارت کی ۔ بہر حال دلچسپ بحثیں رہیں اگر چہ مجمع کم تھا، لوگ کم تھے ۔اردو دانوں میں جیلانی بانو، انور معظم، تسنیم سلیم چھتاری باہر سے اور چند حضرات وہاں سے شریک تھے۔ میں ۱۱/مئی کو واپس آ گیا۔ آپ بھی پٹنہ میں ہوتے تو اچھا تھا۔

اب علی گڑھ یونیورسٹی سے اطلاع آئی ہے کہ میٹنگ ۱۸/مئی یعنی سنیچر کو، ۱۱ بجے دن کو ہے۔ ابھی تک طے نہیں کر سکا کہ آؤں گا یا نہیں، اختر اور رینوی صاحب سے طے ہوا تھا کہ میٹنگ ۲۲/ کو ہو تو اچھا ہے معلوم نہیں انھوں نے اس سلسلہ میں خط و کتابت کی یا نہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو، میں آ جاؤں اور پھر تنہا رہوں اور میٹنگ نہ ہو۔ بہر حال ۱۸/ کو نو بجے کے قریب انتظار کر لیجئے گا۔ ابھی تک وہاں سے ٹی اے کا چک نہیں پہنچا، غالباً آتا ہوگا۔ مرثیئے ابھی تک پڑھ نہیں سکا۔ ضرور لکھوں گا، اختر پیامی کی نظم بھی دیکھوں گا اور جلد تفصیل سے لکھوں گا۔ عزیزہ شاہدہ حیدری کو دعا، رینا کو پیار

خیر طلب: احتشام (۶)

۲۶/نومبر ۱۹۵۶ء لکھنؤ یونیورسٹی لکھنؤ

برادرم کلام حیدری صاحب تسلیم

محبت ناموں نے ممنون بنا دیا۔ آپ کے گذشتہ خط کا جواب دینے ہی والا تھا کہ آج آپ کا دوسرا خط مل گیا ساتھ ہی اردو مجلس کے اراکین کے خطوط بھی ملے ۔ میرا خود جی چاہتا ہے کہ ہے حاضر ہوں اور آپ لوگوں سے ملوں ۔ آپ کے بارے میں نہ جانے کیوں خیال تھا کہ آپ پورنیہ میں ہیں ۔اس اتفاق نے اور خوشی دی کہ آپ سے کئی سال پہلے جو ملاقات پٹنہ میں ہوئی تھی اس کی تجدید ہو گی ۔ ادارہ سال میں بھی میں حاضری دوں گا۔

۲/ دسمبر کو الہ آباد میں ہندوستانی اکیڈمی کی ایک میٹنگ ہے، اگر اس میں گیا تو وہیں سے براہ راست آؤں گا۔ بہر حال ۳/ کو صبح کے وقت وہاں پہونچ جاؤں گا۔ اس دن کالج کی خدمت میں حاضر رہوں گا۔ ۴/ کو گیا دیکھوں گا اور کسی ایسی گاڑی سے چلوں گا کہ ۵/ کی صبح کو لکھنؤ پہنچ جاؤں ۔ آج رات ٹائم ٹیبل دیکھ کر اردو مجلس کے سکریٹری صاحب کو مطلع کروں گا۔

آپ کا احتشام حسین (۷)

۸/ دسمبر ۱۹۵۶ء لکھنؤ یونیورسٹی لکھنؤ

عزیز من تسلیم

میں ۵/کوڈھائی بجے لکھنؤ پہنچ گیا۔تارکچھ ایسا جلد نہیں آیا۔دوسرے دن ساڑھے گیارہ بجے ملا تھا۔راستہ میں کوئی خاص تکلیف نہیں ہوئی لیکن تھکن کا احساس گھر پہونچ کر ضرور ہوا۔میں آپ لوگوں کی مہمان نوازی کے لئے بے حد شکر گزار ہوں بلا تکلف کہتا ہوں کہ گھر سے زیادہ آرام ملا۔جتنا وقت بھی وہاں گذرا اچھا گذرا۔ڈاکٹر صاحب (ڈاکٹر ابوالخیر مرحوم) کی خدمت میں تسلیم کہئے گا اور میری جانب سے مزاج پرسی کیجئے گا۔بیگم شاہدہ حیدری کو تسلیم۔ادریس صاحب سے بھی تسلیم کہئے گا۔

خیر اندیش:احتشام حسین **(۸)**

متذکرہ بالا تینوں خطوط کی اطلاعات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ حتشام صاحب کو کلام حیدری اور ان کے بہار سے انھیں کتنی والہانہ محبت تھی اور ہر بلاوے پر دوستوں سے ملاقات کے شائق بھی رہتے تھے۔ادبی جلسوں میں ان کی شرکت اس بات کی غماز ہے کہ ادب کی سمت و رفتار کے تعین میں ان کی خصوصی دلچسپی رہتی تھی۔ان ادبی جلسوں میں احتشام صاحب اپنے مخالفین کو بھی بڑے غور سے سنتے تھے اور جہاں ان کو اعتراض ہوتا اس کو اپنی تقریر کے دوران انتہائی خوبصورتی سے معترضین کو دلنشین جواب دیتے تھے۔ادبی جلسوں کی رپورٹیں بھی مختلف خطوں کے ذریعہ مختلف دوستوں کے گوش گزار ہوئی ہیں۔

منکسرالمزاج احتشام حسین خودنمائی و خود پرستی سے دور کا بھی علاقہ نہیں رکھتے تھے۔وہ جس شہرت اور مقبولیت کے حامل تھے اس میں خودنمائی کا کیڑا الگ جانا فطری بات معلوم ہوتی ہے لیکن یہ ان کی ذاتی شرافت اور نجابت کا خاصہ ہے کہ وہ ہمیشہ اس مہلک بیماری سے بچتے رہے۔اس امر کا بین ثبوت ایک خط ہے جو انھوں نے ایک طالب علم (اکبر رحمانی جلگانوی) کے خط کے جواب میں لکھا ہے:

محترمی تسلیم!

شرمندہ ہوں کہ خط کے جواب میں تاخیر ہوئی۔اول تو آپ کا خط ہی بہت دیر میں ملا۔ان دنوں یہاں فسادات ہو رہے تھے۔پھر ان کا سلسلہ جاری ہوا تو اب کچھ سکون ہوا۔دوسرے یہ کہ یہاں امتحانات وغیرہ شروع ہو گئے۔تیسرے یہ کہ میں اس کا کیا جواب دوں کہ آپ میرے متعلق تحقیقی کام کرنا چاہتے ہیں۔یہ مناسب موضوع ہے یا نہیں،میری ذاتی رائے یہ ہے کہ ہمیشہ ایسے موضوع کا انتخاب کرنا چاہئے:**(1)** جس کی طرف رجحان ہو **(2)** مواد تلاش کرنے میں آسانی ہو یا امید ہو کہ کافی مواد مل جائے گا **(3)** جس پر کام کرنا مفید ہو اور جب شائع ہو تو اس سے دوسروں کو بھی استفادہ کا موقع ملے۔اگر آپ نے ان باتوں پر غور کر لیا ہے تو مجھے کچھ کہنا نہیں ہے۔ابھی بہت سے موضوع ایسے ہیں جن پر کام کرنے کی گنجائش ہے لیکن اپنے مطالعہ،طبعی میلان اور ہدایت کی سہولتوں کی بات ہے۔اگر یہ مضمون منظور ہو گیا ہو تو مجھ سے جو مدد ہو سکے گی ضرور کروں گا۔امید ہے کہ آپ بخیر ہوں گے۔

احقر احتشام حسین **(۹)**

دورِ حاضر میں آج کوئی طالب علم کسی بھاری بھرکم نام نہاد دانشور سے اگر طالبِ مشورہ ہو کہ وہ اسی عظیم شخصیت پر تحقیق کرنا چاہتا ہے تو آنجناب اس طالب علم کی اول تو خود ہی رہنمائی کر دیتے اور اس بات سے بلیوں اچھلتے کہ ان پر تحقیقی کام ہو رہا ہے (بعض حضرات تو باقاعدہ اس کی تحریک چلا رہے ہیں کہ ان کی ادبی خدمات پر کام کیوں نہیں ہوتا اور وہ باقاعدہ طالب علموں کو اپنی خدمات کے سلسلہ میں خودساختہ مجوزہ خاکہ **Synopsis** لئے پھرتے ہیں)۔احتشام حسین کی شرافت دیکھئے کہ انھوں نے اس طالب علم کے خط کا جواب دینے میں بھی تاخیر کی اور جب جواب

مرحمت فرمایا تو بنیادی اصول تحقیق بھی بیان کر دیے۔اکبر رحمانی جلگانوی نے احتشام حسین کی مکتوب نگاری کے تعلق سے ایک اور خاص نکتہ کی جانب اشارہ کیا ہے جس کی وضاحت یہاں مناسب معلوم ہوتی ہے جس سے احتشام حسین کی شخصیت کے کچھ اور پہلو نمایاں ہوتے ہیں:

''میری ان سے پہلی ملاقات جلگاؤں اسٹیشن پر ہوئی تھی جب وہ بمبئی اردو ادیبوں کی کانفرنس میں شرکت کے لئے جا رہے تھے۔اس مختصر سی ملاقات میں ان کی پرخلوص مشفقانہ اور ہمت افزا باتوں نے دل پر ایسا اثر کیا کہ آج ان کی یاد آتی ہے تو آنکھوں سے بے اختیار آنسو رواں ہو جاتے ہیں۔اس سے قبل مرحوم سے خط وکتابت تھی۔راقم الحروف ان کی شخصیت اور فن پر تحقیقی مقالہ لکھ رہا تھا جب بھی کوئی بات دریافت کرنے کی نوبت آتی خط لکھ دیتا اور جواب فوری طور پر بھیج دیتے تھے۔خط کے ایک ایک لفظ سے خلوص،محبت اور شفقت ٹپکتی تھی۔تکبر،خودنمائی،بے جا بڑائی کا نام ونشان تک نہ ہوتا''(۱۰)

یہ بات بھی کسی سے چھپی نہیں ہے کہ وہ اپنے شاگردوں سے بے پناہ محبت کرتے تھے اور ان کی رہنمائی اور سرپرستی کرنے میں فخر محسوس کرتے تھے۔اپنے عزیز ترین شاگرد محمد حسن کی ذہنی پرداخت میں ان کی تحریروں نے بیش بہا اثرات مرتب کئے ہیں۔محمد حسن کو احتشام حسین نے جتنے بھی خطوط لکھے زیادہ تر میں انھیں 'عزیزم' سے مخاطب کیا ہے جس سے احتشام حسین کی دوراندیشی اور مستقبل شناسی کا جوہر بھی کھلتا ہے کہ وہ باصلاحیت طالب علموں کو بغیر کسی دقت کے پہچان لیتے تھے۔محمد حسن کو انھوں نے ہمیشہ دل ودماغ کے قریب رکھا اور اسی ذہنی قربت کا نتیجہ تھا کہ محمد حسن نے اپنے تنقیدی نظریات سے ایک زمانے کو متاثر کیا۔مندرجہ ذیلو خط سے اس قلبی قربت کا اندازہ ہو جائے گا:

۲/اپریل ۱۹۵۳ء،لندن

عزیزم،دعائیں

۲۷/ مارچ کو لندن پہنچا تو آپ کا خط ملا۔میں ۲۱/ مارچ کو امریکہ سے کوئن الزبتھ نامی جہاز میں بحری سفر کر کے ۲۶/کو ساؤتھمپٹن پہنچا اور ۲۷/کو لندن۔واٹرلوُ کے اسٹیشن ہی پر آل حسن،ان کی بیوی اور بہن مل گئے اور ایسی مانوس فضا پیدا ہوگئی کہ میں حیرت سے لندن کو دیکھ بھی نہ سکا۔اب تک یہاں آئے ہوئے ایک ہفتہ ہو رہا بہت کم باہر نکلا ہوں گویا اپنے خیال مین تھکن مٹا رہا ہوں! آپ اپنی صحت کے متعلق لکھتے ہیں کہ تو مجھے بڑا دکھ ہوتا ہے،مجھے اب یہ احساس ہے کہ آپ اس کی طرف سے غافل نہیں،جب ایسے جسم اور ایسی صحت سے سابقہ ہو تو آپ غافل رہ بھی کیسے سکتے ہیں۔بہرحال جہاں تک ہو سکے جسم اور دماغ کو آرام کا موقع دیجئے۔دہلی کانفرنس کے متعلق بہت کچھ جاننے کو جی چاہتا ہے،اب یہ واپسی ہی پر ہو سکے گا۔پرسوں اتفاق سے ایک دکان پر **Indian Hit** کا وہ نمبر مل گیا جس میں زبان کے مسئلہ پر ڈرافٹ اور جعفری کا مضمون ہے۔ڈرافٹ تو اتنا برا ہے کہ میں اس سے زیادہ غلط،مبہم اور شرانگیز اور الجھے ہوئے ڈرافٹ کا تصور کر ہی نہیں سکتا لیکن جعفری کے مضمون سے میں زیادہ تر متفق ہوں۔میری رائے میں ابھی تک تو کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے،مجھے یقین ہے کہ مستقبل میں یہ دو زبانیں ایک ہوں گی اور لسانیاتی ارتقا کے فطری عمل سے......غالبًا موجودہ ہندی کی تعلیم وغیرہ بھی اس پر اثر انداز ہوگی۔اور اردو ایک طرح کی ہندستانی بن کر نیا چولا بدلے گی......زبان اور رسم خط کے تعلق کے متعلق بھی میری رائے وہی ہے جو پہلے تھی لیکن تقدیر کی تبدیلی کی کیا شکل اور ذرائع ہوں گے،ابھی نہیں کہہ سکتا۔اردو کے معاملہ میں کچھ ایسی مایوسی کا شکار رہا ہوں کہ کیا ہو رہا ہے اور کیا ہونا چاہئے۔سب الجھ گئے ہیں۔جذبی مجھ سے خوش کب تھے جو اَب خفا ہیں۔بعض دوستوں کی ناخوشی آج تک میری سمجھ میں نہیں آتی۔غالبًا ناخوشی کا سبب

'فروزاں' کا رویہ ہوگا یا سرؔور کی شاعری پر مضمون......اورتو کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی ۔پھر یہ آزردگی بے سبب بھی تو ہوسکتی ہے۔یہی حال سلام کا رہتا ہے۔مجھے کبھی کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کب اور کیوں خوش ہیں یا ناخوش ہیں۔

داد دیجئے کہ میں نے امریکہ میں **Love in Machine Age** ڈھونڈھ نکالی۔اچھی خاصی جستجو کے بعد ایک کاپی مل گئی جو کسی قدر **Soild** معلوم ہوتی ہے۔میں نے بوجھ کے خیال ساری کتابیں امریکہ ہی میں راک فیلر فاؤنڈیشن کے حوالے کردی ہیں کہ وہ بھجوادیں غالبًا میرے ساتھ ہی پہنچیں گی۔انگریزی مضامین کے متعلق میں آکر باتیں کروں گا لیکن اس درمیان میں آپ ذرا امریکی پبلک' کے نقطہ نظر سے معلوماتی مضامین لکھ ڈالیے۔افسانوں کے ترجمے اجازت لے کر کر ڈالئے۔مجھے لکھئے کہ کوئی مضمون یا افسانہ بھیجنے کے لیے تیار ہے یا نہیں تو میں پتہ لکھوں اور خط بھی لکھ دوں۔آؤں گا تو اس سلسلہ میں زیادہ تعمیری اور مفید باتیں ہوں گی۔

لندن میں ملنے والے تو بہت ہیں لیکن ابھی تک ملاقات دو تین ہی سے ہوئی ہے۔فیروز کو میں نے ٹیلی فون کیا اور پھر ان کے دفتر انڈیا ہاؤس بھی گیا،آج پھر ملنے کا وعدہ ہے۔تمہیں پوچھ رہی تھیں،غوث وغیرہ بھی ابھی ملاقات نہیں ہوئی بعض میرے پرانے جاننے والے یہاں ہیں جنھیں آپ نہ جانتے ہوں گے،آہستہ آہستہ ہر ایک سے ملوں گا،کافی وقت پڑا ہوا ہے۔میں یہاں گھبرا تو نہیں رہا ہوں لیکن اب جی چاہتا ہے کہ واپس آؤں اور اسی فضا میں گھریلو زندگی کی انھیں الجھنوں میں کھو جاؤں جو زندگی کا جز بن چکی ہیں۔

صفیہ اختر کے مرنے کی خبر مجھے نیویارک ہی میں کسی خط سے مل گئی ہے۔اختر کا پتہ مجھے معلوم نہیں اس لیے تعزیت کی دو سطریں بھی نہ لکھ سکا۔یہاں ان کی وہ نظم بھی دیکھی جو انھوں نے لکھی ہے۔میں نے سنا تھا کہ مجاؔز بہن سے بہت مانوس ہیں اگر ان پر اثر ہے تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔میں اب ان رشتوں کی طاقت اور تقدس کا قائل ہوں۔سرؔدار کو بھی آج ہی کل میں خط لکھوں گا۔

ادھر مسعود صاحب اور سرور صاحب کے خطوط بھی ملے۔سرور صاحب کے خط سے یونیورسٹی کے متعلق بہت سی باتیں معلوم ہوئیں۔کلب کا حال ملا اور انھوں نے اپنی ایک بہت اچھی غزل بھیجی۔اردو پر انھوں نے جو نظم لکھی تھی وہ مجھے پہلے بھیج چکے ہیں،بہت اچھی ہے۔انھوں نے خود اس خطرے کا اظہار کیا ہے کہ کہیں شاعری اور کاموں کی راہ میں حائل نہ ہوجائے۔میں نے کل ہی مسعود صاحب کو اور سرور صاحب کو خطوط لکھے ہیں۔تین دن کے اندر میں نے قریب قریب بیس خط،مفصل اور طویل لکھے ہیں،اب چند خطوں کے جواب اور باقی رہ گئے ہیں۔گھر کے خطوں سے آپ کے خبر لیتے رہنے کا حال معلوم ہوتا رہتا ہے۔میری کتاب کے خوبصورت چھپنے کا حال کئی ذرائع سے معلوم ہوا،آج میں نے اس کے اور دست صبؔا کے لیے خط لکھا ہے۔دیکھوں کب تک آتی ہیں۔آل حسن اچھے ہیں۔کبھی کبھی مستقبل کی باتیں کرتے ہیں،یعنی اگلے سال جب یہاں کا معاہدہ ختم ہوگا تو پھر اس کی تجدید کرانا چاہیے یا ہندستان واپس جانا چاہیے،ان کی بیوی اچھی ہیں۔اپنے **Law** کے امتحان کی تیاری کررہی ہیں۔میری طرف سے سب جاننے والوں کو تسلیم کہئے۔مجاؔز،کماؔل،سلاؔم اور دوسرے دوستوں سے بھی سلام کہئے

خیر طلب

احتشام حسین (۱۱)

پروفیسر سید احتشام حسین کا خاصا وقت خط لکھنے اور خط کا جواب دینے میں صرف ہوجاتا۔اس کے علاوہ ان کے ذمے امور خانہ داری سے متعلق بھی کچھ کام رہا کرتے تھے جس کے سبب ان کی مصروفیت اتنی بڑھ جاتی کہ خط کا جواب دینے میں تاخیر بھی ہوجاتی اور اس تاخیر کے سبب

ان کوشرمندگی کا بھی احساس ہوتا جیسا کہ مذکورہ پیش خطوط میں اس کا اظہار بھی انھوں نے مکتوب الیہ سے کیا ہے۔ادبی کاموں کے علاوہ سماجی ذمہ داریاں میں بھی ان کی زندگی کا ایک اہم حصہ تھیں۔باقر مہدی کے نام ان کا ایک دلگداز خط ملاحظہ کیجئے۔اس خط سے احتشام حسین کی اس شدید الجھن کا انداز بخوبی کیا جاسکتا ہے کہ گھریلو ذمہ داریوں اورادبی کاموں کے درمیان توازن برقرار رکھنا کتنا مشکل کام ہے:

یکم/ دسمبر، بارودخانہ لکھنؤ

عزیزم

پہلے آپ کا خط ملا کہ آرہا ہوں اوراب آپ لکھتے ہیں کہ آنہیں سکتا بہت سے لوگوں کو مایوسی ہوئی۔مجھے خود افسوس ہوا کہ بہت دنوں کے بعد ملاقات ہوتی۔میں ادھر بہت دنوں سے غلط قسم کی مصروفیتوں میں پھنسا ہوا ہوں۔چھوٹے بھائی کی شادی بھی دسمبر کے تیسرے ہفتے میں طے ہوگئی ہے، بڑی الجھنوں میں ہوں۔آج ایک ضرورت سے الہ آباد اور وہاں سے ایک دن کے لیے گیا (بہار) جارہا ہوں۔ایک اردو مجلس کا سالانہ جلسہ ہے۔نہ جاؤں تو برا اور جاؤں تو مصیبت۔۵/ کو واپس ہوں گا۔آپ نے سوانح عمری کے متعلق جو اشارات مانگے ہیں وہ ۶/ کو صبح بھیج سکوں گا۔بالکل موقع نہیں ملا۔آپ نے یہ نہیں لکھا کہ یہ کس کام کے لیے ہے۔کتاب کے لیے یا مضمون کے لیے......لکھنؤ ہی سے ایک میسوری طالب علم سید شاہ علی نے اس موضوع پر پی ایچ ڈی کی......اب وہ پاکستان میں ہیں۔بہر حال میں مختصر سی باتیں لکھ کر بھیج دوں گا۔ابھی یہاں فیض کا مجموعہ نہیں پہنچا۔**David Dinshes** کی کتاب یہاں بھی آ گئی ہے۔ابھی میرے ہاتھ نہیں لگی ہے۔اعجاز صدیقی کی تجویز دلچسپ ضرور ہے لیکن اس کی تکمیل وقت لگے گا کس کو فرصت ہے کہ مضمون لکھے۔میری پیدائش واقعی تو ۲۱/ اپریل ۱۹۱۲ء ہے لیکن سرکاری کاغذات میں ۱۱/ جولائی ۱۹۱۲ء

دعا گو:احتشام (۱۲)

ادب برائے زندگی کا نظریہ احتشام حسین کی تحریروں کا جوہر ذاتی ہے۔ادب کو پرکھنے کا ان کا یہ نظریہ زندگی کو ہی نہیں، ادب کو بھی با مقصد بناتا ہے۔اپنے خیالات کے اظہار میں کسی قسم کا تکلف نہیں برتتے اور قلم برداشتہ لکھتے چلے جاتے ہیں۔کلیم الدین احمد اپنے ایک مضمون 'سید احتشام حسین : تضاد کے شکار' میں اس سچائی کے برخلاف اعتراضات پیش کرتے ہیں۔کلیم الدین احمد کا اعتراض ہے کہ ''سید احتشام حسین ادب اور اخلاق پر روشنی ڈالتے ہیں لیکن اسے بھی اندھیرے میں چھوڑ دیتے ہیں۔''احتشام حسین کی مقصدیت کو سمجھنے میں کلیم الدین احمد سے کہیں لغزش ہوگئی ہے جس کے سبب ان کو احتشام حسین کا وہ ادبی رویہ سمجھ میں نہیں آیا جس کے وہ پیروکار تھے کیونکہ کلیم الدین احمد کی آنکھوں پر مغربی چشمہ چڑھا ہوا ہے اس چشمہ سے ان کو وہی چیزیں نظر آتی ہیں جو مغرب انھیں دکھانا چاہتا ہے جب کہ احتشام حسین اپنے منبع تحریر وقلم کی سریت کی یوں عقدہ کشائی کرتے ہیں:

''میں کیوں لکھتا ہوں، اپنی جذباتی آسودگی اور روحانی تسکین کے لیے......میں کیوں لکھتا ہوں، کوئی اندرونی لگن ،کوئی پراسرار قوت، کوئی نامعلوم طاقت، کوئی بے نام سی تخلیقی صلاحیت، کوئی وجدانی کیفیت میرے ہاتھ میں قلم دی دیتی ہے اور میں لکھ دیتا ہوں......میں اپنے علم کی روشنی دوسروں تک پہنچانا چاہتا ہوں''(۱۳)

☆☆☆☆☆

حواشی:

(1) احتشام صاحب: کچھ یادیں کچھ باتیں/ پروفیسر شارب ردولوی (ماہنامہ آج کل نئی دہلی جولائی ۲۰۱۲/ص ۷)
(2) احتشام صاحب: کچھ یادیں کچھ باتیں/ پروفیسر شارب ردولوی (ماہنامہ آج کل نئی دہلی جولائی ۲۰۱۲/ص ۷،۸)
(3) ماہنامہ آہنگ احتشام نمبر، گیا (بہار) ۱۹۷۳ء/ص ۴۹
(4) ماہنامہ آہنگ احتشام نمبر، گیا (بہار) ۱۹۷۳ء/ص ۴۸
(5) ماہنامہ فروغ اردو، لکھنؤ، احتشام نمبر ۱۹۷۲ء/ص ۵۳۷
(6) ماہنامہ آہنگ احتشام نمبر، گیا (بہار) ۱۹۷۳ء/ص ۲۳۹،۲۴۰
(7) ماہنامہ آہنگ احتشام نمبر، گیا (بہار) ۱۹۷۳ء/ص ۲۳۸
(8) ماہنامہ آہنگ احتشام نمبر، گیا (بہار) ۱۹۷۳ء/ص ۲۳۹
(9) احتشام حسین: ایک شفیق استاد/ اکبر رحمانی جلگانوی (ماہنامہ آج کل نئی دہلی اپریل ۱۹۷۳ء)
(10) احتشام حسین: ایک شفیق استاد/ اکبر رحمانی جلگانوی (ماہنامہ آج کل نئی دہلی اپریل ۱۹۷۳ء)
(11) ماہنامہ فروغ اردو، لکھنؤ، احتشام نمبر ۱۹۷۲ء/ص ۵۳۵،۵۳۶
(12) ماہنامہ نقش کوکن بمبئی، جولائی ۱۹۷۳ء/ص ۷
(13) سید احتشام حسین: ایک تاثر/ پروفیسر سید محمد عقیل (ماہنامہ آج کل نئی دہلی جولائی ۲۰۱۲/ص ۱۰)

(صفحہ نمبر ۴۵ سے آگے)

اس اعتبار سے کوئی ہندوستانی ان کے مقابلے میں نہیں ٹھہرتا بلکہ ٹائمز آف انڈیا لندن کے مطابق انگریزوں میں بھی شاید بہت ہی کم ان سے بہتر لکھ سکتے تھے کسی نے خوب لکھا ہے کہ پھر بھی مسٹر محمد علی جب مولانا محمد علی بنے تو سراپا تبلیغ بن گئے مسجد دہلی میں عالمانہ وعظ کہنے لگے وہ کانگریس مسلم لیگ اور خلافت کانفرنس جیسی جماعتوں کے صدر رہے لیکن انہیں فخر تھا تو خادم کعبہ ہونے پر انھوں نے دل وجان سے اسلامیان ہند کے حقوق کے تحفظ بقا سالمیت اور آزادئ وطن عزیز کے لئے جنگ لڑتے ہوئے بسر کی جنگ تیر وتفنگ شمشیر وسناں سے نہیں تیر وسناں زباں سے شمشیر قلم اور زبان و بیان کے تیر وتفنگ سے قاہرانہ تحریر سے اور نا قابل تسخیر تقریر فخار سے نعرہ ہائے تکبیر سے دل ہلانے والے اور فلک بوس ذکر وفکر کی ضربوں سے قیود و بند میں چکی پیستے پیستے صعوبوں باطل شکن انداز ہائے تخاطب وخطابت وصحافت سے ان کی سیرت وکردار پر شاید H.G.Wells نے بہترین تبصرہ اس طرح کیا ہے کہ ''مولانا کا دل نیپولین کا دل ہے مولانا کا قلم برکلے کا قلم ہے اور مولانا کی زبان برک کی زبان ہے'' میں اس کو مزید شان وشوکت سے اس طرح مزین کرتا ہوں کہ مولانا کا دل حیدری دل ہے مولانا کا قلم علامہ سیوطی کا قلم ہے اور مولانا کی زبان سحر البیان سحبان کی زبان ہے اور فصاحت وبلاغت آمیز صحافت کا نشان جوہر فشاں ہے اور گوہر بیان ہے

☆☆☆☆☆